ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اکتوبر-نومبر ۲۰۲۰ء | جلد ۱۲ | شمارہ ۴-۵ | صفر- ربیع الاول ۱۴۴۲ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد انصاری 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس، علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

Designed and composed by Abdullah Maroofi, Mob. 8218439622; email-almarufi.abdullah369@gmail.com

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹرپرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	اہل فکر اور قائدین کا مقام اور ذمہ داری	مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	
۲-	اداریہ	نئی قومی تعلیمی پالیسی کے مدارس پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟	مدیر	۳
۳-	خاص تحریر	کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶
۴-	مطالعۂ قرآن	کامیابی کی قرآنی علامتیں	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۱۶
۵-	بحث و تحقیق	سرسید احمد خاںؒ اور معاصر دینی مدارس سے ربط	ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی	۳۱
۶-	// //	تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی اور معارف السنن.....	حافظ انس بلال	۳۹
۷-	تعلیم و تربیت	محرومی	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۱
۸-	نقطۂ نظر	داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵۶
۹-	// //	نئی نسل کا مستقبل تابناک کس طرح ہوسکتا ہے؟	مفتی امانت علی قاسمی	۶۰
۱۰-	گوشۂ ادب	ماہر القادری کی نعتیہ شاعری کا منفرد بیانیہ (قسط۲)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶۳
۱۱-	تعارف و تبصرہ	ماہنامہ الفرقان ''ذکر حفیظ''	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۵۶
۱۲-	// //	متاعِ شمیم	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۶۱
۱۳-	شعر و ادب	نعتیہ رباعیات	رئیس الشاکری	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

نئی قومی تعلیمی پالیسی کے مدارس پر کیا اثرات پڑ سکتے ہیں؟

راقم سطور کو مذکورہ بالا عنوان پر ایک کلاوڈ ڈسکشن (Cloud Discussion) میں شرکت کا موقع ملا، راقم نے جو کچھ عرض کیا اسے مرتب کر کے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ظاہر ہے کہ ابھی نئی تعلیمی پالیسی کا مسودہ صرف ایک گائیڈ لائن ہے، اس کا مکمل پروگرام ڈزائن ہونا اور قانون سازی ابھی باقی ہے، حتمی طور پر کوئی بات اس کے بعد ہی کہی جا سکتی ہے، یوں بھی یہ مسودہ تضادات و ابہام کا پُلندہ ہے، خوشنما عناوین کے ساتھ بہت کچھ پردۂ خفا میں رکھا گیا ہے اس لیے اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرنا اور صرف مثبت نقطۂ نظر (Positive aproch) سے دیکھنے کی بات درست نہیں، بلاشبہ اس میں اچھے پہلو ہیں، مثبت چیزیں ہیں مگر برسر اقتدار جماعت کی اپروچ، نیت کارکردگی اور مقاصد کو دیکھتے ہوئے یہ بھروسہ صرف مسٹر وزیر اعظم کا مشہور مہمل جملہ ''سب کا وشواس'' محسوس ہوتا ہے، اور پھر بعض تجزیہ نگاروں کے مطابق اس پالیسی میں آر ایس ایس کی ۶۰ فیصد آراء تسلیم کی گئی ہیں، اس لیے ہمیں اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، خدشات پر توجہ دینی چاہیے اور مستقل و متحد اقدام کرنا چاہیے، این سی آر ٹی کے نصاب میں اس طرح کی جو تبدیلیاں کی گئیں وہ منظر عام پر آ چکی ہیں۔

(۱) پوری پالیسی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیکولرزم کو ختم کر کے پورے ملک میں ایک نئی سوچ کو عام کرنے کا پختہ ارادہ ہے۔

(۲) مدارس کا پوری پالیسی میں کہیں ذکر نہیں ہے، البتہ ایک لفظ Alternative یعنی متبادل کا استعمال کیا گیا ہے، اب اسکی مراد کیا ہوگی مدارس، گروکل، آشرم یا پاٹھ شالہ ابھی کچھ معلوم نہیں۔

(۳) پالیسی میں جہاں متبادل تعلیم کا تذکرہ ملتا ہے وہاں یہ بھی وضاحت ہے کہ متبادل تعلیم میں بھی قومی نصاب پڑھانا لازمی ہوگا تبھی ان متبادل اداروں کی تعلیمی حصہ داری قابلِ قبول ہوگی، (قومی نصاب کے کچھ رجحانات این سی آر ٹی کی تبدیلیوں سے واضح ہو چکے اور کچھ اس پالیسی کے مطالعہ سے ظاہر ہیں) اب سوال یہ ہے کہ اگر ''متبادل'' میں مدارس کو شامل کیا گیا تو پھر وہ بھی اس قومی نصاب کے پابند ہوں گے، یہ بھی وضاحت موجود ہے کہ بتدریج متبادل اسکولی نمونوں کو میں اسٹریم میں لایا جائے گا۔

(۴) بعض لوگ پالیسی میں مدارس کا ذکر نہ ہونے کو مثبت سمجھ رہے ہیں لیکن مجھے یہ بات صریح غلط فہمی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ جب ذکر نہیں ہوگا تو مدارس کی تعلیمی حصہ داری جسکا ملک کے تعلیمی نظام اور خواندگی کی مقدار کے اضافہ بغیر کسی حکومتی امداد کے میں بڑا حصہ ہے اس کا اعتبار بالکل ہی ختم ہو جائے گا بلکہ اغیار کے اس سسٹم کا مذاق بنانا مزید آسان ہوگا۔

(۵) کالجز کو ڈگری دینے کا مجاز کر دیا گیا ہے تو گویا الحاق (Affiliation) کی شکل ختم ہو جائے گی، اس طرح مدرسی سند

بے حیثیت ہوگی اور یونیورسٹی میں داخلہ ممکن نہ ہوگا، یہ کہنا کہ یونیورسٹی ایک خودمختار ادارہ Autonomous Body ہے اسے الحاق کا حق باقی رہے گا قبل از وقت ہے، اس پالیسی کی اصل روح اور اختیارات کو سلب کرنیکی پالیسی شاید اسے باقی نہ رہنے دے، اختیارات کو سلب کرنے سے متعلق تفصیلی گفتگو ہم گذشتہ اداریہ میں کر چکے ہیں۔

(۶) پوری پالیسی میں کہیں بھی عربی کا ذکر نہیں ہے جو خود ہی ایک بڑا سوال ہے، دیگر پہلوؤں کے علاوہ اس کے اثرات از خود اس الحاق پر پڑیں گے۔

(۷) یہ پالیسی ایک یکساں اسٹینڈرڈ کی بات کرتی ہے، بھارتی کلچر، بھارتی سنسکرتی، بھارتی ثقافت، بھارتی علوم و تاریخ و تہذیب کو فروغ (Promot) دینے کی بات کرتی ہے، سوال یہ ہے کہ کیا مدارس اس سے بچ سکیں گے، اگر دستور کی دفعہ ۲۹-۳۰ کا حوالہ دیا جائے تو کیا اب اس حکومت کی نیت اور کارکردگی دیکھتے ہوئے اس سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دستور میں ترمیم اور چھیڑ چھاڑ سے گریز کرے گی۔

(۸) اگر مدرسہ بورڈ کو ہی حکومت لازم کردے تو پھر آزاد مدارس کیا کریں گے جیسا کہ بعض صوبوں میں مدرسہ بورڈ ریفارم کی تیاریاں چل رہی ہیں، اور مدرسہ بورڈ سے ملحق مدارس کیا قومی نصاب پڑھائیں گے اور اگر قومی نصاب پڑھائیں گے تو کیا مدرسہ کا تشخص باقی رہے گا؟

(۹) اس پالیسی کے تحت ابتدائی تین سال کی تعلیم لازمی ہوگی، تو کیا بچے کا مدرسہ میں پڑھنا لازمی تعلیم میں شمار کیا جائے گا، جب RTE کا قانون آیا تھا تو اس میں بھی یہی خطرہ تھا بلکہ والدین کی گرفت کی بات کہی گئی تھی جس پر اس وقت کی حکومت سے گفت وشنید کے بعد مدارس کو استثنا دے دیا گیا تھا، یہ پالیسی اس پہلو سے مزید خطرناک ہے کہ ابتدائی تین سال کی تعلیم کے لیے تین سالہ بچے آنگن واڑی کی تربیت میں دیے جائیں گے جہاں اغلب یہی ہے کہ انھیں بچپن میں ہی پراچین بھارت کی سنسکرتی و شخصیات کے احترام کی تربیت دی جائے گی۔

(۱۰) ایک موقر شخصیت نے یہ خیال ظاہر کیا کہ تمام مدارس کو اس نئی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر اور آگے کے مراحل کو دیکھتے ہوئے متفقہ طور پر نصاب تعلیم (جزوی فرق کے ساتھ) اور مدت تعلیم یکساں طے کر لینا چاہیے، دوسرے ایک محترم نے صاف کہا کہ ہمیں وقت رہتے قانونی گرفت سے بچنے کے لیے سنجیدگی سے کوئی متحدہ لائحہ عمل طے کر لینا چاہیے، راقم نے ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھ کر تیسری بات اور آگے کی کہی (جو میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں) کہ ملک میں کئی منظور شدہ تعلیمی بورڈ ہیں، ہمیں یعنی ملی تنظیموں اور بڑے اداروں کو غور کرنا چاہیے اور یہ متحدہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنا ایک تعلیمی بورڈ منظور کرائیں، جس کا اپنا نصاب ہو، وہ نصاب میں جزوی آزادی کے ساتھ مدارس کو ایک متعین فیس کے ساتھ الحاق دے اور ایکزام کنڈکٹ کرائے، مدارس کے متوسطہ کو ہائی اسکول اور عالیت کو 12th کی سند دے، اس طرح ہمارے مدارس منظور شدہ بھی ہو جائیں گے، اس زمانہ کے مطابق بنیادی ضرورت یعنی ہائی اسکول کی سند بھی مل جائے گی، مین اسٹریم سے اپنے تشخص کے ساتھ تعلق بھی ہو جائے گا اور حکومتی دست برد سے بچنے کے لیے مستقل تحفظ (Permanente Protection) بھی حاصل ہوگا، اسکے متعلقہ پہلوؤں پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے اور تیزی سے عمل کرنے کی ضرورت ہے، وقتی اور عارضی مسائل اور عارضی حل کی تلاش نے ہی ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے، ضد اور روایت سے ہٹ کر سنجیدہ غور وفکر اور ایکشن پلان ہی مستقبل کے تحفظ کی ضمانت ہے، لیکن یہاں یہ سوال ہے کہ کیا اس حکومت

میں یہ اتنا اہم کام ممکن ہو سکے گا تو حتمی طور پر کوئی جواب دے پانا ممکن نہیں، حکومت اگر چاہے تو نہ صرف قانون سازی کے ذریعہ بلکہ محض ایک نوٹیفکیشن کے ذریعہ اس بورڈ کو منظوری دے سکتی ہے، لیکن کیا وہ ایسا کرے گی، جبکہ ہمارے سامنے ایک اردو بورڈ، ICSC اور جامعہ اردو جیسی مثالیں موجود ہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا، حکومت جس طرح متنوع مسائل میں گھری ہے اس کو دیکھتے ہوئے مثبت کوششوں نتیجے میں یہ سوغات دے بھی سکتی ہے ورنہ کوشش کرنے میں کیا جاتا ہے، آج نہیں تو کل سہی، اگر ملک کے دس بارہ صوبائی حکومتوں سے بھی منظور کرالیا جائے تو مرکزی حکومت مجبور ہو کر مجبور ہو کر منظوری دے گی، لیکن مستقبل کے لیے کامیاب اور ٹھوس و مستقل حل یہی ہے، کہ مسلمانوں کے انتظام وانصرام میں ایک بورڈ ہو جس کا اپنا نظم ونسق اور ماڈرن نصاب ہو، جو اسکولوں کے ساتھ مدارس کو بھی اس نصاب کو پڑھانے کی شرط کے ساتھ الحاق دے، یہ کام پہلے بہت آسان تھا، جب حکومت نے خود مدرسہ بورڈ کے لیے ارباب حل وعقد کو مدعو کیا تھا تو گفت وشنید کے بعد اس طرح کا بورڈ تشکیل دیا جا سکتا تھا جس کی نظیر ICSC پیش کرتا ہے، خیر تب نہیں ہو سکا تو غور وفکر اور جدو جہد کا باب کھلا ہے اور کھلا رہے گا، اس ملک میں ہماری زندگی سرحدی سپاہی جیسی ہے، ہمیں مواقع سے فائدہ اٹھانا ہے اور آنے والی نسلوں کے ایمان وعقیدہ اور اسلامی تشخص کے لیے تحفظات فراہم کرنے کے لیے ٹھوس اور پائیدار حل تلاش کرنا ہے، واللہ ولی التوفیق والنجاح۔

نوٹ: اس پالیسی سے بحیثیت اقلیت مسلمانوں کو اور دیگر اقلیات کو کیا نقصان ہوگا، اختیارات محدود کرنے، رزرویشن ختم ہونے اور پرائیوٹائیزیشن کے کیا نقصانات کس کو ہوں گے اس پر ہم پہلے کچھ روشنی ایک مضمون میں ڈال چکے ہیں۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی)

دعائے مغفرت کی درخواست

گذشتہ ۶ ستمبر کو علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن علی گڑھ کے معتمد مالیات پروفیسر محمد مسعود خالد صاحب کی اہلیہ محترمہ کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا، مرحومہ نیک سیرت، شریف النفس اور دیندار خاتون تھیں، تمام قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ سیئات کو حسنات سے مبدل فرمائے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ پسماندگان ومتعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، بالخصوص ہمارے معتمد مالیات صاحب کو اس عمر میں جو صدمہ لاحق ہوا ہے اس پر اللہ انھیں صبر عطا فرمائے اور بہترین اجر سے نوازے۔ (آمین)

اسی طرح ہمارے فاؤنڈیشن کے رکن تاسیسی جناب انوار احمد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ۱۱ ستمبر کو اس دنیا سے رخصت ہوگئے، قارئین سے ان کے لیے بھی دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے والدین اور اہلیہ اور ان کے چھوٹے بچوں کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

۱۵ ستمبر کو علی گڑھ ہی نہیں برصغیر کی معروف علمی ودینی شخصیت پروفیسر یسین مظہر صدیقی ندوی سفر آخرت پر روانہ ہوگئے، مرحوم کا انتقال دنیائے علم وتحقیق بالخصوص فن سیرت نگاری اور اسلامی تاریخ کا ایک عظیم خسارہ ہے، مرحوم نے عہد حاضر میں ان دونوں میدانوں میں تجدیدی کام انجام دیا، ماضی قریب میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے بعد انھیں کا نام نامی لیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں ان کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ ترین مقام عطا فرمائے۔ (انشاء اللہ ان پر تفصیلی مضمون آئندہ شمارہ میں شائع کیا جائے گا)

❑ خاص تحریر

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

آخر اتنی تیزی سے عرب ممالک کیوں اسرائیل سے مصالحت کر رہے ہیں؟
آخر امریکہ اسرائیل کے لیے کیوں بچھا جا رہا ہے، اس کا اس قدر استحکام کیوں چاہتا ہے؟

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

پہلے دنیا نے دیکھا کہ عرب اسرائیل خفیہ تعلقات وتعاون کی بابت کچھ دیوانے مستقل لکھتے اور بولتے رہتے ہیں لیکن ان کی باتوں پر کان دھرنے کے بجائے ان کی تضحیک کی جاتی ہے، پھر بالآخر سب نے دیکھ لیا کہ متحدہ عرب امارات نے زندگی کے مختلف شعبوں میں باہمی تعاون اور دوطرفہ سفارتی تعلقات کا اعلان کیا، بلکہ اس معاہدہ کی اطلاع ٹرمپ نے پہلے دی، پھر یہ بھی دیکھا گیا کہ اسرائیلی جہاز حرم کی فضاؤں سے اڑتا ہوا جب ابوظبی کے ائیر پورٹ پر اترا تو ''ذہنی غلام'' سرخ قالینوں پر اسرائیلی وفد کو سلامی دینے کے لیے کھڑے نظر آئے، گویا مسلمانوں کے قاتلوں کا یہاں استقبال پھولوں کی سیج پر کیا گیا، ہم نے بھی کہا تھا اور بہت سے تجزیہ نگاروں نے لکھا تھا کہ جلدی ہی اور بھی اطلاعات آئیں گی جو آ گئیں، بلکہ آج کی تازہ خبر کے مطابق ۶ رمسلم ممالک مزید اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہے، ٹرمپ کا یہ بیان بڑے پیمانہ پر نشر ہوا ہے، جبکہ مصر اور اردن پہلے ہی اسے تسلیم کر چکے ہیں، ۱۱ رستمبر کو ہم نے دیکھا تھا کہ بحرین اسرائیل مصالحتی معاہدہ کا اعلان پھر ٹرمپ نے ہی کہا، ابھی کہاں؟ ابھی تو حیلوں کی جانب سے اعلان ہو رہا ہے، ابھی ''گرو جی'' کا اعلان باقی ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ سارے اعلانات سعودیہ کی رضامندی سے ہو رہے ہیں، سعودیہ کی منشا کیا ہے اور وہ ان اقدامات سے کس قدر راضی ہے یہ سب کچھ عبدالرحمٰن السدیس کے خطبہ سے ظاہر ہو گیا، جنھوں نے دنیا کے سب سے بڑے ظالم وغاصب اور خونخوار دہشت گردوں سے حسنِ سلوک کی تلقین کی جو سرتاسر ولا وبراء کے صریح قرآنی بیانات اور سیرت نبوی کے خلاف ہے، لیکن بہرحال ان کو حکم یہی ہے کہ وہ فضا سازگار بنائیں تو حکم کی تعمیل ان کی مجبوری ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کے لیے منبر حرم استعمال ہو رہا ہے، جیسے نیک نامی اور سیاسی بالادستی کے لیے حج کا سیاسی استحصال ہوتا ہے، جبکہ سعودیہ کا دعویٰ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ حرمین اور حج کو ہر طرح کی سیاست سے دور رکھا جائے، سعودیہ جو سنچری ڈیل میں غیرت وحمیت کا سودا کر چکا اس کے تمام تر تعلقات غیر رسمی طور پر بحال ہیں بس اعلان باقی ہے، ابھی تو وہ اپنے چھوٹے بھائیوں سے اعلان کرا رہا ہے، خود ابھی اس

کے اعلان نہ کرنے کی وجہ دونوں ہاتھ میں لڈو رکھنا ہے، اسے مسلم دنیا کو فریب بھی دینا ہے، ان کا گروبن کران کا سودا بھی کرنا ہے، اعلان سے نفاق کے بادل چھٹ جائیں گے اور مشکلات بڑھ جائیں گی کیونکہ عوام میں ابھی رمق باقی ہے اور غیرت زندہ ہے، پھر ان کا آقا امریکہ بھی نہیں چاہے گا کہ سعودیہ کا راز ابھی فاش ہو جس سے اس کی سیاست امریکہ کے حریف روس اور سعودیہ کے حریف ایران اور اس اتحاد میں شامل ترکی کے مقابلہ کمزور ہو۔

جس تیزی سے عرب ممالک اسرائیل کے استحکام کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے ظہور کا دور قریب تر ہے، اس پہلو سے قطع نظر تیسری جنگ عظیم کے امکانات بھی بڑھتے جا رہے ہیں، کیونکہ یہود کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ جب بھی طاقت ور ہوئے ہیں انھوں نے زمین میں فساد و خونریزی کی داستان رقم کی ہے، عربوں کی مجبوری یہ ہے کہ وہ پوری طرح امریکہ کے غلام ہیں، خلافت عثمانیہ کو توڑ کر اس پورے خطہ کو چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں تقسیم ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ عربوں کی طاقت کبھی مجتمع نہ ہو سکے اور پھر کبھی وہ ماضی کی عظمت و قیادت کا خیال دل میں نہ لا سکیں، چنانچہ یہی ہوا کہ یہ جاگیردار آپس میں منتشر، خدا کے عطا کردہ وسائل کا مالک ان کا آقا امریکہ، یہ ضروریات زندگی میں بھی اس کے محتاج، اپنے وجود و بقا اور اپنی سیکورٹی و سلامتی کے لیے ان کو امریکہ کی ضرورت، جب امریکہ ساری ضرورتیں پوری کرے گا اور تحفظ فراہم کرے گا تو قیمت بھی وصول کرے گا، یہی ہو رہا ہے، تعلیم و ٹکنالوجی اور صنعت و خود مختار معیشت کے نتیجہ میں ہی آزادی و خود مختاری حاصل ہوتی ہے، قرآن کی عظمت پر قربان جایئے، اس نے اسی لیے تو ''اعداد و قوت'' کی تلقین کی تھی، لفظ قوت کے استعمال میں ایسی وسعت ہے کہ اس نے تمام وسائل کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا ہے جو دشمن خدا کی مرعوبیت کا سبب بنیں، مگر اس سے غافل اور ان تمام عناصر سے عاری عرب ممالک اپنی اصل طاقت ''ایمان'' سے بھی محروم ہو گئے ترجون من اللہ مالا یرجون کی حقیقت ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی، پھر جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مناجات تو مقرر ہے ہی، غور کیجئے ایک طرف امریکہ ۱۸/سال بعد افغانستان سے نکلنے کی راہیں ڈھونڈ رہا ہے، اس وقت بھی دوحہ میں مذاکرات (بین افغان) جاری ہیں، جو افغانستان میں امن قائم کرنے کا دعویٰ لے کر آیا تھا وہ اس پر راضی ہے کہ اب تم لوگ خود طے کر لو کہ افغانستان میں نظام حکومت کیسا ہوگا، دوسری طرف مادی و ایمانی وسائل سے عاری عرب امریکہ کی چوکھٹ پر جبہ سائی کے لیے خود مجبور ہیں، خود ہی اپنی جاگیریں اس کے دامن میں ڈال کر اسے مضبوط کر رہے ہیں اور سنچری ڈیل کی تکمیل کا سبب بن رہے ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ یہ ایمان سے عاری منافق ہیں تو لوگوں کو برا لگتا ہے حالانکہ قرآن مجید کے الفاظ صریح ہیں، اس نے منافقین کے جو کردار بیان کیے ہیں وہ جب بھی کسی میں پایا جائے گا تو وہ عملاً منافق ہی قرار پائے گا، دشمنان خدا یہود سے (جن کو قرآن نے مغضوب علیہم قرار دیا ہے) دوستی کرنا منافقین کا ہی کردار ہے ولو کانوا یؤمنون باللہ والنبی وما انزل إلیه ماااتخذوهم اولیاء و لکن کثیرا منهم فاسقون (مائدہ ۸۱) ''اگر یہ لوگ اللہ اور نبی پر ایمان رکھتے اور جو نبی پر اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے تو یہ کافروں سے تعلق نہ قائم

کرتے ان کو اپنا قریبی دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں''، ان ہی دل کے مریضوں اور بے ایمانوں کے بہانے بازی کی بابت فرمایا گیا۔ فتری الذین فی قلوبھم مرض یسارعون فیھم یقولون نخشی أن تصیبنا دائرۃ (مائدہ ۵۲)

''آپ دیکھیں گے ان دل کے روگی منافقین کو کہ یہ ساری دوڑ دھوپ ان ہی کی خاطر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کہیں ہم زد میں نہ آجائیں'' نخشیٰ أن تصیبنا دائرہ کی نفسیات ہی آج ایک غاصب اور لاکھوں فلسطینیوں کا خون اپنی گردن پر رکھنے والی قوم سے دوستیاں رچانے پر مجبور کر رہی ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اسرائیل مغرب کی جنی ہوئی ایک ناجائز اولاد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ بیسویں صدی کی سپر پاور اور امکانیات و وسائل سے معمور امریکی طاقت آخر اسرائیل کو اس قدر کیوں مستحکم کرنا چاہتی ہے؟ جبکہ مذہبی، لسانی، تاریخی اور جغرافیائی ہر اعتبار سے دونوں کا اختلاف بہت نمایاں ہے پھر بھی کیا وجہ ہے کہ اسرائیل کے استحکام و تحفظ کے لیے امریکہ ''ویٹو پاور'' کا بھی استعمال کرتا رہا ہے، اس کی خاطر وہ اپنے حلیفوں کو بھی ناراض کرتا رہا ہے، یہ بھی واضح ہے کہ عرف عام کے مطابق امریکہ استعماری طاقت بھی نہیں ہے، بلکہ بظاہر امریکہ کا فروغ استعمار کو ختم کرنے اور حریت کو مستحکم کرنے کے لیے ہوا تھا، لیکن وہ اس ریاست کے استحکام کے لیے اپنے تمام وسائل نچھاور کرنے پر آمادہ ہے جو کہ استعمار کی تاریخ میں سب سے بدترین استعمار ریاست ہے، اسرائیل اب اس پوزیشن میں ہے کہ فلسطینیوں سے ان کی بقیہ زمین بھی خالی کرالے اور ان کو وہاں سے مکمل طور پر بے دخل کردے، ماضی کی تاریخ اور موجودہ صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ امریکہ اسرائیل کو اس کے تمام پڑوسی ممالک پر نہ صرف مسلط کرنا چاہتا ہے بلکہ ان کی اراضی بھی اس کے قبضہ میں دینا چاہتا ہے، سوال یہ ہے کہ امریکہ جیسی بڑی طاقت جو سائنس و ٹکنالوجی، صنعت و معیشت ہر اعتبار سے فائق ہے اور جس سے دوستی و محبت کا اس خطہ کی تمام ریاستیں دم بھرتی ہیں وہ آخر اسرائیل نوازی میں اس قدر کیوں دیوانہ ہے، بقول ایک لبنانی سیاست داں کے ''امریکہ نے اپنا سب کچھ اسرائیل کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے گویا اسرائیل منصوبہ تیار کرتا ہے اور امریکہ اس کے نفاذ کی تگ و دو کرتا ہے''۔

حیرت ہوتی ہے کہ لوگ اس جانب توجہ کیوں نہیں دیتے اور کیوں نہیں دیکھتے بالخصوص عرب توجہ کیوں نہیں دیتے کہ امریکہ ہمیشہ صہیونیوں کا معاون رہتا ہے ان ہی کی طرف مائل رہتا ہے، ان کے ہر ظلم کی تائید کرتا ہے، مسلمانوں کے ہر آئیڈیل اور کامیاب نمونے کو ختم کرنے پر آمادہ رہتا ہے، افسوس تو اس پر ہے کہ مسلمان سبق کیا سیکھتے اب تو ہماری مسلم کہی جانے والی حکومتیں اس کے اس عمل میں شریک ہیں، ترکی کے ناکام فوجی انقلاب سے لے کر تا حال کی کارروائیاں اس پر شاہد عدل ہیں، امریکہ ساری کارروائیاں کر رہا ہے اور مسلمانوں کے دہشت گردی کے ایک ماکرانہ جال میں اس طرح پھنسا دیا ہے کہ وہ آج تک اسی کی ادھیڑ بن میں لگے ہیں مگر ابھی تک اس سے نکل نہ سکے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ امریکہ نے شروع سے ہی اسرائیل کی پشت پناہی کی ہے، اس سے متعلق معاہدات و قرار

دادوں کی ہمیشہ موافقت کی ہے، اس کی یہی تاریخ رہی ہے، یہ الگ بات کہ عربوں کو خلافت عثمانیہ سے کٹنے کے بعد یہ حسن ظن رہا کہ امریکہ عدل ومساوات اور حریت کا حامی و علمبردار ہے، ظاہر ہے کہ امریکی لیڈران وروٴساء بالخصوص جیفرسن، لنکن اور ولسن جیسے لوگ بڑی چرب زبانی کے ساتھ ان پرفریب نعروں کی یقین دہانی بھی کراتے تھے، افسوس تو اس پر ہے کہ عربوں نے اس کے دوغلے رویے سے کبھی سبق نہیں حاصل کیا، انھیں کبھی حقیقت نظر نہیں آسکی، وہ اس کے جال میں پھنستے ہی چلے گئے، ۱۹۱۷ء میں معاہدہ بالفور کی امریکہ نے تائید کی، ۱۹۲۲ء میں برطانیہ نے جب فلسطین سے متعلق قرارداد پاس کی تو امریکی کانگریس نے اس کی تائید کی، اس کے بعد امریکہ نے عملاً فسلطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کی، ۱۹۴۲ء میں جب عالمی صہیونی کانفرنس نے یہ قرارداد پاس کی کہ فلسطین کو یہودی ریاست قرار دیا جائے اور وہاں کے اصل عرب باشندوں کو جلاوطن کیا جائے تو اس وقت کے امریکی صدر فرنکلن روزولٹ نے اس کی تائید کی، یہی نہیں بلکہ ۱۹۴۴ء کے انتخابات میں ریپبلکن اور ڈیموکریٹک دونوں ہی پارٹیوں نے اس صہیونی قرارداد کی نہ صرف تائید کا اعلان کیا بلکہ الیکشن میں کامیابی پر اس کی تطبیق ونفاذ کا وعدہ بھی کیا، چنانچہ فرنکلن روزولٹ نے انتخابات میں کامیابی کے بعد ملک عبدالعزیز سے ۱۹۴۵ء کی اپنی ملاقات میں یہ مطالبہ بھی کیا وہ مدینہ سے متصل اراضی بالخصوص خیبر میں یہود کو بسنے کی اجازت دے دیں، کیونکہ اسلام سے قبل یہ لوگ وہیں بستے تھے، یہ بھی کہا کہ اس کے بدلہ میں یہودی انھیں ۲۰ ملین جنیہ سونا دیں گے لیکن اس وقت ملک سعود نے اس مطالبہ کو مسترد کردیا تھا، ۱۹۴۵ء میں اس امریکی صدر کی موت کے بعد اس کے نائب ہیری ٹیرومن نے عہدۂ صدارت سنبھالا تو یہود کے تعاون کے لیے امریکی سیاست میں مزید شدت آگئی، اس نے برطانوی وزیراعظم کو خط لکھا کہ یکبارگی ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل کردیا جائے، اس طرح بلاقید وشرط یہودیوں کی فلسطین ہجرت اور یہودی ریاست کی راہ ہموار کی جائے۔

۱۹۴۷ء میں جب اقوام متحدہ میں تقسیم فلسطین کی قرارداد پیش کی گئی تو جنرل اسمبلی سے پاس کرانے میں امریکہ کی جان توڑ کوششیں شامل رہیں، بلکہ تقسیم کا جو خاکہ پیش کیا گیا تھا، امریکہ اس سے زیادہ اراضی اسرائیل کو دینے پر مُصر رہا، قیام اسرائیل کے بعد جب یہودیوں اور فلسطینیوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہوئیں اور لڑائی چھڑی تو امریکہ نے ہر سطح پر اسرائیل کی مدد کی، میڈیا کے ذریعہ حمایت کی، مالی امداد کی، دنیا کو فریب دے کر بلکہ آنکھوں میں دھول جھونک کر ٹینک، بکتر بند گاڑیاں اور اسلحے فراہم کیے، ہیری ٹیرومن کا حال یہ تھا کہ ۱۹۴۸ء میں جیسے ہی قیام اسرائیل کا اعلان ہوا ویسے ہی چند منٹوں میں اس نے اس کی ریاستی اور قانونی حیثیت کو تسلیم کرنے کا اعلان کردیا، امریکی یہودیوں کا ایک وفد سب سے بڑے ربی کی سربراہی میں اس کی خدمت میں حاضر ہوا، اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس سے کہا: ”آپ کو آپ کی ماں کی رحم میں اللہ نے رکھا ہی اس لیے تاکہ آپ جنم لیں اور پھر آپ کے ہاتھوں دو ہزار سال بعد دوبارہ اسرائیلی ریاست قائم ہو“۔

یہ تو محض چند جھلکیاں ہیں ورنہ امریکی تاریخ

میں اسرائیل کی تائید وحمایت اور طاقت رسانی میں سال بہ سال اضافہ ہی ہوتا رہا ہے، امریکہ نے اسرائیل کی نہ صرف سیاسی طور پر پشت پناہی کی بلکہ اس کو اقتصادی، تجارتی فائدے پہنچائے، ہتھیار فراہمی کے سب رکارڈ توڑ دیے، ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں اسرائیل کی پلاننگ میں امریکہ شریک تھا جس کے نتیجہ میں اسرائیل گولان کی پہاڑیوں اور سینا کے حصے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوا، لبنان کے بعض خطہ پر ۱۹۸۲ء میں جب اسرائیل نے غاصبانہ قبضہ کیا اور ہزاروں لوگوں کی جانیں لیں تو اس کو نہ صرف امریکہ کی حمایت حاصل تھی بلکہ امریکہ نے اسے خطرناک ترین بم سپلائی کیے تھے، واقعہ یہ ہے کہ امریکہ نے جس طرح اسرائیل کو راضی کرنے، صہیونیوں کو خوش کرنے کے لیے نوازشات کی بارش کی ہے وہ نہ صرف بے مثال ہے بلکہ لائق تعجب ہے، لیکن افسوس اس پر ہے کہ امریکہ کا دم بھرنے والے عربوں نے کبھی اس جانب توجہ نہ کی، مغربی سیاست کا سب سے اہم ہتھیار ''در پردہ مقاصد'' کا حصول ہے، عراق پر امریکی حملہ اور تسلط اسرائیل کے تحفظ کے لیے تھا، اسرائیل اور اس کی کمپنیوں نے ہی اس جنگ میں امریکہ کو بھرپور تعاون دیا یا پھر سعودیہ شانہ بشانہ کھڑا رہا، در پردہ مقصد عراقی پٹرولیم پر قبضہ تھا جو صد فیصد مکمل ہوا۔

سوال یہ ہے کہ امریکہ کی طرف سے یہ ایک طرفہ نوازش کیوں؟ امریکہ آخر کیوں اتنی بھیانک سیاسی غلطی کرتا جارہا ہے، بے حد وحساب اور بلا قید وشرط آخر وہ کیوں صہیونی ریاست کو استحکام بخشنے کی تگ ودو میں مصروف ہے؟ تجزیہ نگاروں نے اس کا جواب اپنے اپنے طور پر دیا ہے، ہم یہاں دارالقلم دمشق کے بانی مشہور مولف اور اسرائیلی سیاست کے تجزیہ کار مرحوم محمد علی دولہ کا جواب نقل کرتے ہیں جو انھوں نے تجزیہ نگاروں کے حوالے سے دیا ہے:

بنیادی طور پر اسرائیل کے لیے امریکی سیاست کے اس جھکاؤ اور اس کی مطلق تائید وحمایت کی وجوہات کچھ اس طرح ہیں:

(۱) امریکہ میں موجود یہودی لابی کا دباؤ۔

(۲) امریکہ کا اسرائیلی ریاست کو امریکی جمہوریت اور مغربی تہذیب کے امتدار کے طور پر دیکھنا۔

(۳) مشرق وسطیٰ سے وابستہ وہ امریکی مصالح جن کے حصول کی خاطر اسرائیل کا وجود ضروری ہے۔

جہاں تک امریکہ میں موجود صہیونی لابی کا تعلق ہے تو سب جانتے ہیں کہ امریکی سیاست پر اس کا کنٹرول ہے، صہیونی ریاست کی بے قید وشرط تائید کے لیے اس لابی کا وجود سب سے اہم ہے، کیونکہ امریکی انتخابات میں یہودی ووٹ کا حصول اسی لابی کی رضامندی پر منحصر ہے، پھر یہ یہودی لابی امریکہ میں سب سے بڑی اقتصادی طاقت ہے، پورے امریکی میڈیا پر اسی لابی کا قبضہ ہے، یہی لابی وہاں کی پروپیگنڈہ مہم کو کنٹرول کرتی ہے، ایک اہم بات یہ ہے کہ اس لابی کے پاس امیدواروں کی خفیہ فائلیں ہوتی ہیں، البتہ اس پریشر میں یہودی ووٹ کی فی الحقیقت کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ یہ امریکی آبادی میں آٹے میں نمک کی طرح ہیں، جہاں تک ان کے سب سے بڑی اقتصادی طاقت ہونے کا مسئلہ ہے تو بایں اعتبار کہ براہ راست وہ نہ بڑے بینکوں کے مالک ہیں نہ بڑی کمپنیوں کے لیکن ہر جگہ ان کی شراکت داری نے ان کو اہم اور بڑی اقتصادی طاقت بنا دیا ہے، اس شراکت داری کی بڑی تعداد کے سبب وہ ایک بلاک اور ایک

اتحاد کی طرح حاوی رہتے ہیں، اسی وجہ سے مقابل کو اقتصادی ریس میں ڈرانے دھمکانے کا دہشت گردانہ رویہ بھی اپناتے ہیں، البتہ میڈیا پر اس کا لابی مکمل تسلط ہے، اس لابی کا یہی سب سے مضبوط ہتھیار ہے، اخبار، ریڈیو، ٹی وی، ویب سائٹس پر اس کا قبضہ ہے، صحافیوں کی خرید وفروخت اس کا مشغلہ ہے، میڈیا کے ذریعہ یہ لابی جیسے چاہتی ہے امریکی سماج کو چلاتی ہے، برین واش کرتی ہے، رائے عامہ ہموار کرتی ہے، کسی بات کو اس قدر پھیلاتی اور دوہراتی ہے کہ انسان صحیح وغلط کی تحقیق سے بے پرواہو کر اوندھے منہ اس پر گر پڑتا ہے، اس لابی کے پاس اشتہار بازی کی ایسی طاقت ہے کہ ہر چینل اور اخبار اس کا محتاج ہے، کیونکہ صحافت دراصل آج اسی اشتہار سے پیسہ کماتی ہے، چنانچہ میڈیائی پروپیگنڈہ اور ذرائع ابلاغ پر مکمل قبضہ کی وجہ سے وہ ہر شخص کا ایسا پرسنل ڈاٹا جمع کر کے رکھتی ہے جسے عوام کے سامنے رکھنے سے کسی بھی شخصیت کا سارا سیاسی وجود بکھر کر سکنڈوں میں رہ جائے، اس کے پاس امیدواروں کا رکارڈ ہوتا ہے کہ کس نے ٹیکس چوری کی ہے، کس کے معاشقے رہے ہیں، کس نے تجارت میں دھوکہ دھڑی کی ہے، کس کے اخلاقی اور سماجی معاملات صحیح نہیں رہے ہیں، چنانچہ ان دونوں کامیاب حربوں سے یہ لابی امریکی سیاستدانوں کو ہر حال میں کنٹرول کر ہی لیتی ہے، اگر کوئی انحراف کرتا ہے تو اس کی پروپیگنڈہ مہم اس کو بالآخر اس کی رعایت کرنے اور اسرائیل نوازی کے لیے مجبور کر دیتی ہے، ماضی میں اس کی کئی مثالیں دیکھی گئی ہیں لیکن یہاں مزید تفصیل کا موقع نہیں۔

جہاں تک دوسرے سبب کا تعلق ہے کہ امریکہ اسرائیل کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ گویا وہ امریکی جمہوریت اور مغربی تہذیب کا امتداد ہے، ایک بچھڑے ہوئے معاشرے میں حریت کی علمبردار اور ترقی پسند ریاست ہے، بہت سی امریکی شخصیات ان ہی الفاظ کے ساتھ غاصب صہیونی ریاست کو متصف کرتی رہی ہیں، مثلاً اسرائیل آزادی کی مہم کا نتیجہ ہے، وہ جمہوریت کا گڑھ ہے، وہ فاشسٹ طاقتوں کے درمیان آزادی کا استعارہ ہے، قومیت عربیہ کی متشدد تحریک اور کمیونزم کے خلاف وہ ایک مضبوط قلعہ ہے، وہ ایک آزاد جمہوری ملک ہے، وغیرہ وغیرہ..... حقیقت یہ ہے کہ ان خوبصورت عناوین کے ذریعہ صہیونی ریاست اور بالخصوص امریکہ نے مغرب کو بلکہ دنیا کو ہمیشہ فریب دیا ہے، دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکا ہے، اسرائیلی ریاست صرف طاقت اور ہتھیار کے بل پر قائم ہے، اس کی حکومت بندوق کے زور سے چلتی ہے، وہاں جمہوریت کے بنیادی اصولوں تک کا فقدان ہے، فلسطینیوں کو بندوق کی نوک پر چلانا، بچوں کو قتل کرنا، بے قصور خواتین کو جیل میں ڈالنا، فلسطینیوں کو جلاوطن کرنا آخر جمہویت کے کس اصول کے تحت جائز ہے۔

اسرائیل کے لیے امریکی تائید وحمایت کا ایک سبب تجزیہ نگاروں نے ''مشترک مصالح'' ذکر کیا ہے، صحیح بات یہ ہے کہ یہی سب سے اہم سبب ہے جس کی خاطر امریکہ تمام تر تگ ودو کرتا ہے، مشرق وسطیٰ میں اپنے استبداد کو مضبوط کرنے کے لیے امریکہ اسرائیل کو مستحکم کرتا ہے، کیونکہ اسرائیل کا استحکام ہی مشرق وسطیٰ میں امریکی وجود کا ضامن ہے، امریکہ کو یہ قطعی گوارہ نہیں کہ اس کا حریف کمیونزم مشرق وسطیٰ میں مضبوط ہو اور اسے چیلنج کر سکے، یہی وجہ ہے کہ وہ عرب ریاستوں پر مکمل کنٹرول حاصل کر کے اب اسرائیل کو اس طرح مستحکم کر دینا چاہتا ہے کہ پھر مشرق وسطیٰ

پر اس کا قبضہ بہر اعتبار مکمل ہو جائے، کیونکہ صہیونیت کو وطن اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کی ضرورت ہے اور امریکہ کو مشرق وسطیٰ کے وسائل کی، امریکہ کو یہ بھی علم ہے کہ عرب ریاستوں میں کمیونزم کبھی بھی مقبول نہیں رہا، سودیت یونین سے کبھی بات نہیں بنی، جس کا فائدہ امریکہ کو ملا اور اس فائدے کو حاصل کرنے کے لیے امریکہ نے اسرائیل کو مستحکم کر کے مسلط کرنے کا راستہ اپنایا، حالانکہ امریکہ جو کچھ کر رہا ہے وہ خود اپنے لیے بھی درست نہیں کر رہا ہے، کیونکہ یہودی قوم ایک ایسی قوم ہے جس کی پوری تاریخ سرکشی سے بھری پڑی ہے، اللہ نے اسے دھتکارا ہے اور "مغضوب علیھم" قرار دیا ہے، تاریخ نے اسے ہر دور میں دھتکارا ہے، یہ ایک ایسی سرکش قوم اور ریاست ہے کہ شامی سیاست داں فارس خوری نے کہا تھا کہ ''صہیونی ریاست سے مصالحت و سفارتی تعلقات گویا پوری امت کی قربانی ہے، اس کے نتیجہ میں مصالحت کرنے والوں کو بڑی مدت تک ذلت ہی ذلت اٹھانی پڑے گی''۔

مذکورہ بالا اسباب وعوامل اور مشترک مصالح کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ بات سمجھ سے پرے ہے کہ آخر ایک سپر پاور طاقت ایک چھوٹی سی ریاست اور چھوٹی سی لابی کے سامنے کیسے اس قدر ذلیل و بے حیثیت اور مجبور ہو سکتی ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے آپ کو بالکل اس کے تابع بنا دے اور ہر آن اسی کے لیے مصروف عمل ہو جائے، واقعہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے دین مسیح کا مذہبی عنصر کارفرما ہے، قیام اسرائیل عیسائیوں کے لیے ان کا مذہبی فریضہ بلکہ ارادۂ الٰہی کی تنفیذ ہے، یہی وہ عنصر ہے جس نے مسیحیوں کو قیام اسرائیل اور پھر اس کے استحکام کے لیے سرگرم عمل رکھا، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق ''یہودیوں کی فلسطین واپسی کا خیال ہمیشہ دیندار نصاریٰ کے ذہنوں میں موجود رہا، بالخصوص برطانوی عیسائیوں میں تو یہ خیال خود یہودیوں سے زیادہ قوی رہا، تھیورڈ ہرزل کے افکار کے وارث اور صہیونی سیاست دان کیم ویزمن نے پروٹسٹنٹ مسیحی لورڈ بالفور کے متعلق کہا تھا'' کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ بالفور نے ہماری محبت میں ہم سے فلسطین کو ہمارا وطن بنانے کا وعدہ کیا تھا؟ ہرگز نہیں! دراصل اس شخص نے ''عہد عتیق'' کی تعلیمات کے مطابق اپنی مذہبی فکر کے جواب میں یہ وعدہ کیا تھا''، یہ بات معلوم ہے کہ نصاریٰ عہد عتیق (جس میں کیتھولک کے یہاں ۳۹ اور پروٹسٹنٹ کے یہاں ۴۶/ کتب شامل ہیں،) پر ایمان رکھتے ہیں اور عہد جدید کو اس کا تتمہ مانتے ہیں، مسیحی یوں بھی کتب مقدسہ کی یہود کے برخلاف تقدیس و احترام کرتے رہے ہیں، تورات پر ان کے ایمان اور ان کی عقیدت کی بنیاد کی طرف قرآن نے اس مکالمہ میں اشارہ کیا ہے جو اللہ کے سامنے انبیاء علیہم السلام) کی پیشی کے وقت حضرت عیسیٰ سے ہوگا، وإذ علمتك الكتٰب والحكمة والتوراة والإنجيل (مائدہ ۱۱۰)۔

واقعہ یہ ہے کہ مسیحی ہمیشہ دھوکہ کھاتے رہے ہیں، یہود نے انھیں ہمیشہ دھوکہ دیا ہے ان پر مظالم بھی کیے اور جب موقع ملا تو ان کے قریب ہو کر ان سے فائدے بھی حاصل کیے، ایک وقت وہ آیا جب مسیحی پوپ نے یہودیوں کی عام معافی کا اعلان کیا، تب سے دونوں کی قربت بڑھ گئی، اور مسیحی تورات کی تقدیس کے سبب اس کی پیش گوئی اور بشارتوں کا لحاظ کرتے ہوئے اسرائیل کے قیام واستحکام کے لیے جی جان سے کوشش کرنے لگے، اس میں شک نہیں

کہ یہودی اپنی سرشت اور تاریخ کے اعتبار سے آج بھی وہی رویہ رکھتے ہیں جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے وقالت الیھود لیست النصاریٰ علی شیٔ لیکن مسیحی ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی بلکہ اس وقت اسلام دشمنی میں مزید دھوکہ کھا رہے ہیں ، ۱۹۴۵ء میں امریکی مسیحی پادریوں نے جو کانفرنس منعقد کی تھی اس میں ۵/ ہزار پادریوں نے امریکی صدر ٹرومان کو یہ میمورنڈم دیا تھا کہ فلسطین کے دروازے یہودیوں کے لیے بلا قید وشرط کھول دیے جائیں، حقیقت یہ ہے کہ اس بابت مسیحی پادریوں، متدینین اور سیاست دانوں کے بیانات بڑے حیران کن ہیں، جنھیں پڑھ کر آنکھیں پھٹی رہ جاتی ہیں، میری نظر سے جو تحریریں گذریں وہ گویا ان کے دل کی آواز ہیں، ان سے ان کے جذبات، مذہبی احساسات اور دوستانہ تعلق صاحب ظاہر ہے، ظاہر ہے کہ یہاں ان کے نقل کرنے کا موقع نہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہی مذہبی اعتقاد، دینی جذبہ، تورات کی پیشین گوئیوں اور حکایتوں سے آخری درجہ کا تاثر دونوں کے اتنے عجیب وغریب اور مضبوط تعلقات کا باعث ہے۔

لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی تائید و حمایت اور اس کے لیے امریکہ کو جواز فراہم کرنے والے ان سب اسباب وعوامل کے باوجود کیا واقعی فلسطین پر یہودیوں کا مذہب کی رو سے کوئی حق ہے، جیسا کہ یہودی دعویٰ کرتے ہیں اور مسیحی بالخصوص پروٹسٹنٹ نہ صرف ان کے دعوے کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ ان کی تائید کرتے ہیں، خود بھی وہ اس کا اعتراف واعلان کرتے ہیں، کیونکہ تمام مذہبی لوگ اور بیشتر سیاست داں کہتے ہیں کہ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ فلسطین ان کا وہ وطن ہے جس کے لیے ہزاروں سال قبل اللہ نے ان سے وعدہ کیا تھا، اس بابت وہ تورات کی متعدد عبارتیں نقل کرتے ہیں، جن کا حوالہ مسیحی بھی دیتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تورات کی ہی عبارتیں اس پر شاہد ہیں کہ یہ وعدہ باقی نہیں رہا بلکہ وہ ساقط ہوگیا، کیونکہ یہود نے نقض عہد کیا، شرطیں پوری ہی نہیں کیں، انبیاء کو قتل کیا، ان کی تکذیب کی، کتاب الٰہی میں تحریف کی، جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ وعدہ ساقط ہوگیا بلکہ ان پر لعنتیں برسائی گئیں، ان کو مختلف مراحل متعدد عذابوں کا مزہ چکھایا گیا، قیامت تک کے ان کو ملعون و مردود قرار دیا گیا، جس کی تصدیق قرآن مجید نے مغضوب علیھم کے ذریعہ کردی، بقول مولانا علی میاں کہ صرف مغضوب علیھم اور نصاریٰ کے لیے ضالین پر غور کیا جائے تو یہ دو لفظ ہی قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل کے طور پر کافی ہیں کیونکہ دونوں ہی اقوام کی تاریخ ان دونوں لفظ کی کھلی ہوئی تفسیر ہے، قصہ مختصر یہود ونصاری عہد قدیم و عہد جدید سے استناد کرتے ہوئے فلسطین پر یہودیوں کے مذہبی حق ثابت کرنے کے لیے جو بھی دلائل دیتے ہیں وہ سب تحریف پر مبنی ہیں اور باطل ہیں کیونکہ ان کا استحقاق ختم کرنے والے انبیاء بنی اسرائیل کے بیانات خود اسی میں موجود ہیں، بالخصوص انجیل متیٰ میں بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت مسیح کے واضح بیانات درج ہیں، اس بابت مزید بحث موجب تفصیل ہوگی جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں۔

ان حقائق پر نظر ڈالنے کے بعد بھی یہ واضح ہے کہ امریکہ کے ذریعہ ایک ظالم و غاصب ریاست کی تائید و حمایت کا موقف کسی طرح بھی درست نہیں خواہ اس کے جواز کے لیے کتنے ہی وجوہات کیوں نہ ہوں، اس لیے کہ قوم یہود کی تاریخ میں لفظ ''وفا'' کا وجود ہے ہی نہیں، اس کی پوری

تاریخ عہد شکنی، ظلم و جبر، غدر و فساد پر مشتمل ہے، خیانت رگ و پے میں سرایت ہے، اگر مسیحی دنیا یہ سمجھتی ہے کہ یہود کے دلوں میں امریکہ اور مسیحیوں کی محبت ہے تو انھیں ویزمین کا بیان یاد رکھنا چاہیے (جو سطور بالا میں آیا) اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ من حیث القوم جس نے خدا کی محبت کو دل سے نکال دیا وہ کسی قوم کی محبت کو کیا خاک باقی رکھ سکے گی، چنانچہ ایک کیتھولک پادری روبرٹ پیرس نے اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے کہا تھا: ''دوستو میں کہتا ہوں کہ قیام اسرائیل کے لیے مغرب کا کردار انتہائی افسوسناک اور کھلی ہوئی غلطی پر مبنی ہے، یہ موقف باعث افسوس اور خطرناک ہے، اس نے جس شر کو جنم دیا ہے آج ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں، ہمیں اب یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نہ اللہ کو دھوکہ دے سکتے ہیں نہ اسے غفلت میں رکھ سکتے ہیں، انسان وہی کاٹتا ہے جو بوتا ہے، کسی قوم کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی کی زمین غصب کر کے اپنا وطن بنائے اور وہاں کے باشندوں کو جلاوطن کر دے اور خود اطمینان سے رہے، اقوام متحدہ کو قطعاً اس کا کوئی اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کا وطن چھین کر کسی اور کو دے دے، .....اگر ووٹوں کی سیاست کے لیے امریکی مسیحیوں نے ایسا کیا اور شیطان نے یہودی ووٹ کا سنہرا خواب انھیں دکھایا تو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ووٹوں کی وجہ سے نہ حقائق مٹائے جاسکتے ہیں اور نہ دنیا کو خاک وخون میں نہلانے کا جواز فراہم ہوتا ہے، دراصل اس پورے فساد کی وجہ وہ صہیونیت ہے جس نے پورے ملک میں اپنے پنجے گاڑ دیے ہیں اور اسی کی حکمرانی ہے، میڈیا اور تشہیری اداروں پر اسی کا قبضہ ہے، میں ایسے اہل قلم کو جانتا ہوں جو میری کہی ہوئی ہر بات پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے مؤید ہیں، مگر صہیونیت اور اس کی دہشت ناک تباہ کاریوں کے خوف سے وہ اس کی صراحت کے ساتھ تائید نہیں کر سکتے، جبکہ ہمارا یہ مذہبی اور اخلاقی فرض ہے کہ ہم اپنے قائدین کو پوری صراحت سے متنبہ کریں اور ان سے کہیں کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بربادی کو دعوت مت دو، پارٹی اور ووٹ کی سیاست سے اوپر اٹھ کر حق بولو، سچ کا ساتھ دو اور مکارم اخلاق اختیار کرو''۔

اس خطرے کو امریکی تاریخ میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ ایک امریکی سیاست داں بنیامین فرنکلن نے محسوس کیا تھا، اس نے امریکی کانگریس کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہود ہیں، اگر ان کی ہجرت پر قدغن نہ لگائی گئی تو ایک دن امریکہ یہود کی گود میں کھیلے گا اور آج یہی ہو رہا ہے، اس نے کہا تھا کہ اگر ان پر پابندی نہ لگی اور یہ آئندہ اسی کثرت سے امریکہ میں آکر بستے رہے تو ان ہی کی حکمرانی ہوگی، یہ ہمیں اپنے اشاروں پر نچائیں گے، اس نے کہا تھا کہ یہ اخلاق سے عاری قوم ہے، اس کے معاملات کی تاریخ ظلم و فساد اور فریب سے بھری پڑی ہے، اگر یہ امریکہ میں رہ گئے تو دو سو سال کے اندر یہ منظر ہوگا کہ تمہارے بچے یہودیوں کے غلام ہوں گے، ان کے کھیتوں میں کام کریں گے اور یہودی محلوں میں داد عیش دیں گے، ان ہی کا پورے امریکی سماج پر تسلط ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہا گر آج امریکہ مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے صہیونی ریاست کی اندھا دھند تائید کر رہا ہے، دنیا بھر میں اپنے مفادات کو داؤ پر لگا رہا ہے، مشرق وسطی کو اسرائیل کے ہاتھوں فروخت کر رہا ہے، تو اسے اس کا ادراک ہونا چاہیے کہ یہودی قوم اس کی بھی نہیں ہوگی،

اسرائیل صرف خلیجی ریاستوں کے لیے ہی خطرہ نہیں ہے بلکہ وہ مسیحی دنیا کے لیے بھی سب سے بڑا خطرہ ہے، امریکی مسیحیت نے کمیونزم کی بیخ کنی کے بعد کیپٹلزم کو گلے لگایا اور اسلام کو اپنا حریف قرار دیا، پھر اسلام کو ویلس نکالا دینے کے لیے اس نے خلیج میں پنجے گاڑے، اور اس کے لیے اس نے اسرائیل کو مستحکم کیا بلکہ اب تو بہت تیزی سے کر رہا ہے، لیکن وہ اندھیرے میں ہے اور اسے اس حقیقت کا ادراک نہیں ہے کہ خلیجی ریاستوں سے معاہدہ امن و مصالحت (Normalisation) کی تکمیل کے بعد اسرائیل پوری دنیا کے لیے خطرہ ہوگا، امریکہ بلکہ پورے مغرب کو اسرائیل کے سلسلہ میں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنا چاہیے، کیونکہ امریکہ جس راہ پر چل رہا ہے اور خلیجی غلاموں کو چلا رہا ہے اس سفر کی تکمیل کے بعد دنیا کی واحد طاقت بننے کے لیے اسرائیل خود اپنے حلیف و معاونین کو ایٹمی جنگ میں جھونک دے گا، ایک عیسائی پادری نے کہا تھا جس کو صرف اس مسئلہ کی حساسیت کے پیش نظر یہاں نقل کیا جا رہا ہے، ورنہ اس کی تعبیر دینی، فکری اور شرعی اعتبار سے مسلمانوں کے یہاں درست ہی نہیں ہوسکتی لیکن اس کی اس تعبیر سے مسئلہ کی سنگینی اور حساسیت واضح ہے، اس نے کہا تھا: ''اسرائیل کے قیام سے خدا نادم ہے مگر مغرب کب شرمندہ ہوگا؟'' اسرائیل کے لیے امریکی تائید وحمایت کے اسباب پر غور کیجئے تو تعجب بھی ہوگا اور افسوس بھی، جنھیں ہم بے دین، دین بیزار بلکہ دہریہ اور مذہب وعقیدے سے آزاد قرار دیتے ہیں ان کے بیانات سے ان کے احساسات کا اندازہ ہوتا ہے، آج بھی اپنے دین کے تئیں ان کا تعصب اور اس سے وابستگی اور کتاب مقدس کی بشارتوں پر ان کے یقین کا اظہار ہوتا ہے، جس کے حصول کے لیے وہ کئی مسلم ممالک تاراج کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں، مگر افسوس کہ جو کتاب وسنت کا داعی بلکہ علمبردار ہے، جس کے پاس لافانی پیغام اور ابدی شریعت ہے، جس کو مستقبل کے فتنوں سے پہلے ہی آگاہ کر دیا گیا وہ آج ان ہی دشمنوں کی زلفوں کا اسیر ہے، جن سے جزیرۃ العرب پاک کر دیا گیا تھا، وہی آج پھر ان کو اپنی جاگیریں اور اپنی دولتیں دے رہا ہے، ایک طرف ان کی حساسیت ان کی وابستگی اور ان کی دیوانگی ہے، دوسری طرف آخری پیغمبر اور آخری کتاب کے علمبرداروں کی بے حسی ہے، بیزاری ہے، غفلت ہے، قرآنی ونبوت محمدی کے ازلی دشمنوں سے دوستی ہے، اس دوستی کا نتیجہ ظاہر ہے، فتربصوا حتی یأتی الله بأمره.....

نوٹ نمبر ۱-تورات میں خدا کی ندامت کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے جو سراسر یہودی علماء کی تحریف وکذب بیانی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی کسی بھی نسبت سے پاک ومبرأ ہے، اس کی طرف ایسی کوئی بھی نسبت کرنا درست ہی نہیں۔

نوٹ نمبر ۲-اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب سے خاص طور استفادہ کیا گیا ہے، بین القوسین درج بیانات ان ہی کتب سے منقول ہے:

كلام في اليهود، لماذا هذا الدعم الامريكي لإسرائيل للأستاذ محمد دوله، اليهودية العالمية و حربها المستمرة على المسيحية لايليا ابوالروس، الموأمرة و معركة المصير اسعد جمعة۔

☆☆☆

❑ مطالعۂ قرآن ❑ قسط : ۳

کامیابی کی قرآنی علامتیں

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات کا مضمون

اب آیئے سورۃ المومنون کی ان آیات کی طرف جن میں کامیابی کا نسخہ بتایا گیا ہے، ان صفات کا ذکر کیا گیا ہے، جن سے ایمان کو کمال اور بندۂ مومن کو وراثت جنت کی بشارت ملتی ہے، اس سورت کی ان ابتدائی آیات کو پڑھنے سے قبل سورہ حج کی آخری آیات پر نظر ڈالئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ(۷۷)وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيداً عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاء عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللَّهِ هُوَ مَوْلَاكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلَى وَنِعْمَ النَّصِيرُ (۷۸)(الحج)

(ترجمہ: اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ کرو، اور اپنے رب کی بندگی کرو، اور بھلے کام کرو، تاکہ تم کامیاب ہو ،اور اللہ کی خاطر جہاد، جدوجہد، اور سعی وکوشش کا حق ادا کرو، اسی لیے تمہیں منتخب فرمایا ہے، اور دین میں تم پر کوئی تنگی اور مشقت نہیں رکھی ہے، اپنے جدامجد ابراہیم کی ملت کو اختیار کرو، اللہ نے تمہارا نام ''مسلم'' رکھا ہے، پہلے بھی اسی نام اور وصف سے تم کو متصف کیا تھا، اور اب اس قرآن کے ذریعہ بھی، تاکہ پیغمبر تم پر گواہ رہیں اور تم پوری انسانیت کے سامنے حق کے گواہ رہو، اور نماز قائم کرتے رہو زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ کے دین کو مضبوطی سے تھامے رہو، وہی تمہارا کارساز ہے، بہترین کارساز، بہترین مددگار۔)

ان آیات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ سورۂ حج جس مضمون پر ختم ہورہی ہے وہیں سے سورہ مؤمنون کی ابتدا ہورہی ہے، وہاں جن امور کا تذکرہ کر کے ''لعلکم تفلحون'' (تاکہ تم کامیاب ہوجاؤ) فرمایا گیا، یہاں تفصیل کے ساتھ کامیابی کی علامتوں کا تذکرہ کردیا گیا اور یہ واضح کردیا گیا کہ جس میں یہ خصوصیات ہوں گی وہ مومن کامل ہوگا اور وہی کامیاب وکامران ہوگا، وہاں شہادت علی الحق کی ذمہ داری سونپے جانے کی بابت اشارہ ہوا اور یہاں اس ذمہ داری کو نبھانے کے لائق بننے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کا اہتمام سے تذکرہ کردیا گیا۔

ان آیات کی خصوصیت

سورہ مومنون کی یہ وہ ابتدائی آیات ہیں جن کے فضائل میں امام ابن کثیر نے متعدد یہ روایات نقل کی ہیں ، حضرت عمر فاروقؓ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر جب کوئی وحی نازل ہوتی تھی تو آس پاس موجود لوگوں کو ایسی آواز آتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کے بھنبھنانے کی آواز، ایک روز ایسی ہی آواز سنی گئی تو ہم ٹھہر گئے کہ تازہ وحی سن لیں، جب آپ ﷺ پر طاری ہونے والی وحی کی خاص کیفیت ختم ہوئی تو آپ ﷺ قبلہ رو ہوکر یہ دعا مانگنے لگے:"اللّٰھم زدنا ولا تنقصنا وأکرمنا ولا تھنا واعطنا ولا تحرمنا واثرنا ولا توثر علینا وارض عنا وارضنا" (اے اللہ ہمیں خوب عطا فرما، کمی نہ فرما، اے اللہ ہمیں عزت عطا فرما ہمیں رسوا نہ فرما، اے اللہ ہمیں اپنے عطایا سے نواز دے ہمیں محروم نہ فرما، اے اللہ ہمیں دوسروں پر ترجیح دے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح نہ دے، اے اللہ ہم سے راضی ہوجایئے اور ہمیں بھی اپنی رضا پر راضی فرما دیجئے) پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ اس وقت مجھ پر یہ دس آیتیں نازل ہوئیں ہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ آیات پڑھ کر سنائیں ،جو ان پر پورا پورا عمل کرے گا وہ سیدھے جنت میں جائے گا۔(جامع الترمذی: ج۵/۳۱۷۳)

یزید بن یابنوس کی روایت ہے کہ انھوں نے ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا کہ حضور ﷺ کے اخلاق کیسے تھے، تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ آپ ﷺ کے اخلاق یعنی آپ ﷺ کی طبعی عادتیں ایسی تھیں جیسا قرآن میں مذکور ہے ،اس کے بعد یہ دس آیات تلاوت فرمائیں اور فرمایا کہ بس یہی خلق و عادت تھی رسول اللہ ﷺ کی۔(نسائی)

فلاح اور مومن کامل

ان دس آیات میں سے پہلی آیت ہے"قد أفلح المومنون" (بے شک کامیاب ہوگئے اہل ایمان) سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ لفظ"فلاح"قرآن مجید میں "خسران" کے بالمقابل استعمال ہوا ہے ، فلاح کے معنی کامیابی وخوشحالی کے حصول کے ہیں تو خسران کے معنی ناکامی و نامرادی کے ہیں، گزشتہ سطروں میں آپ دیکھ آئے ہیں کہ قرآنی سیاق میں کامیابی آخرت کی کامیابی یعنی جہنم سے نجات اور جنت کا حصول ہے، جبکہ اہل دنیا کے نزدیک کامیابی کا مفہوم ہی سرے سے غلط ہے،اس بات کو مزید تقویت اس سے پہنچتی ہے کہ یہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی، جہاں مسلمان اقلیت میں تھے،جن کو خود قرآن نے "مستضعفون فی الأرض"(ملک میں دبے کچلے اور کمزور تھے) قرار دیا ہے، جہاں وہ مظلوم تھے، ان مظلوموں کی نفسیاتی کیفیت کو قرآن نے "أن یتخطفکم الناس" (کہ کہیں لوگ تمہارا اغوا نہ کر لیں) سے تعبیر کیا ہے، ایمان لانے والوں میں ایک تعداد ان مسلمانوں کی تھی جو کمزور اور غیر متحکم تھے، بالعموم ان مٹھی بھر مسلمانوں کی تعداد کفار کے بالمقابل بہ اعتبار دنیا کمزور تھی اور کفار پر تعیش زندگی گزار رہے تھے مگر ان حالات میں ایمان لانے والوں کو بشارت کامیابی کی دی گئی ،جس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ بات آخرت کی کامیابی سے متعلق ہے، جو لوگ ایمان لائے ہیں انھوں نے ہرگز خسارے کا سودا نہیں کیا، بلکہ صحیح معنی میں انھوں نے کامیابی کا نسخہ حاصل کرلیا۔

پھر اگر فلاح کے لغوی معنی (ہر مراد کا حصول اور ہر تکلیف سے نجات) پر توجہ کی جائے تو بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ دنیا میں مکمل کامیابی ممکن نہیں، یہاں وسعت رزق کے وعدے ہیں، اور اس کی تعلیم وتلقین بھی فرمائی گئی مگر اس کے حصول کو اصل نہیں قرار دیا گیا، اصل کامیابی تو جنت کا حصول ہے، جس کی بابت یہ فرمایا گیا:

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُون(فصلت: ۳۱)

(ترجمہ:اور وہاں تم کو وہ سب ملے گا جس کی تم خواہش کرو گے ،اور جس کا مطالبہ کرو گے۔)

اور فرمایا گیا:

لَهُمْ مَايَشَاء ون فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْد(ق ۳۵)

(ترجمہ: وہاں انہیں وہ سب ملے گا جو وہ چاہیں گے ، اور ہمارے پاس اس سے زائداور بہت کچھ ہے(جس کا انہیں تصور وتخیل بھی نہیں)۔

سورۃ الاعلیٰ میں اس کی مزید وضاحت کردی گئی:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى (۱۴) وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (۱۵) بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (۱۶) وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى (۱۷)(الاعلیٰ)

(ترجمہ: یقیناً وہ شخص کامیاب ہے جو پاکیزگی اختیار کرنے والا ہے، جو اپنے رب کا نام لے کر نماز پڑھتا ہے، لیکن اے انسانو! تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت ہی بہتر ہے، اور وہی ہمیشہ رہنے والی ہے۔)

المومنون سے وہی لوگ مراد ہیں جن کے عقائد بھی صحیح ہوں، جو اللہ کی ذات وصفات پر اس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر اور قرآن کی تعلیمات واحکامات پر ایمان رکھتے ہوں اور پھر ان کے اندر آئندہ آیات میں مذکور خصوصیات بھی پائی جاتی ہوں، یہاں یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ فلاح کا مدار درحقیقت ایمان پر ہے، بدون ایمان تمام اچھے اخلاق جو فی نفسہ اچھے ہوں نتیجہ کے اعتبار سے بے کار وا کارت ہیں، خدا تعالیٰ کے یہاں دنیا جن کاموں کو اچھا سمجھتی ہے ان کی بھی بغیر ایمان کے کوئی قیمت نہیں۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالاً(۱۰۳) الَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعاً(۱۰۴) أُولَئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْناً(۱۰۵) ذَلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوا(۱۰۶) (الکھف:۱۰۵)

(ترجمہ: ان سے کہیے کہ ہم تم کو بتائیں کہ کون اپنے اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ دیوالیہ ہوگا، وہ لوگ ہوں گے جن کی ساری جدو جہد دنیاوی زندگی میں ضائع ہوگی اور وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ بڑے اچھے کارنامے انجام دے رہے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیتوں اور اس کے حضور پیشی کا انکار کردیا اور ان کے سارے اعمال اکارت ہوگئے، لہذا قیامت کے دن ہمیں ان کے اعمال کے وزن کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی (ان کی ہمارے یہاں کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔)ان کے کفر کی پاداش میں ان کی سزا جہنم ہوگی، اس وجہ سے کہ انہوں نے میری آیتوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا۔)

سورۂ نور میں اور وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاء حَتَّى إِذَا جَاءَ هُ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئاً وَوَجَدَ اللَّهَ عِنْدَهُ فَوَفَّاهُ حِسَابَهُ وَاللَّهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ(النور: ۳۹)

(ترجمہ: جو لوگ کفر کررہے ہیں (یا کرتے رہے) ان کے عمل کسی چٹیل زمین کے سراب کی طرح ہیں، کہ (دور سے) پیاسا سراب کو پانی سمجھ بیٹھتا ہے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہونچتا ہے تو اسے کچھ نہیں پاتا، بلکہ وہاں اللہ کو پاتا ہے، اور اللہ اس کا حساب چکا دیتا ہے، اور اللہ کے ہاں حساب میں دیر نہیں لگتی۔)

اسی لیے قرآن مجید نے اہل کتاب کو بھی ایمان

بالرسول اور ایمان بالقرآن کی صریح دعوت دی ہے، اس لیے کہ بعثت محمدی اور نزول قرآن کے بعد کوئی بھی سابق نبی ورسول اور کوئی بھی سابقہ آسمانی کتاب نجات دہندہ نہیں ہوسکتی ،ان پر ایمان تب ہی معتبر ہوسکتا ہے جب نبی امی اور قرآن مجید پر ایمان لایا جائے ،قرآن مجید نے دوٹوک الفاظ میں یہ فیصلہ فرمادیا ہے قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعاً الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (اعراف:۱۵۸) (ترجمہ: کہہ دیجئے کہ انسانو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیامبر ہوجس کی آسمانوں اور زمین پر حقیقی بادشاہت چلتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں، وہ جلاتا ہے اور وہی مارتا ہے، (اے لوگو!) اللہ پر اور اس کے رسول ''نبی امی'' پر ایمان لاؤ، جو اللہ اور اس کے کلام اور فرمان پر خود ایمان رکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرو تاکہ تمہیں ہدایت ملے)۔

خشوع

اب ذرا ان فلاح پانے والوں کی خصوصیات پر توجہ فرمائیے، پہلی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ''الذین هم فی صلاتهم خاشعون'' صفات وخصوصیات کے ذکر کی ابتدا نماز سے کی گئی کہ نماز ہی تو راس الطاعات ہے، ارکان اسلام میں توحید کے بعد جس عبادت کا مقام ہے وہ نماز ہے، نماز بہت آسانی کے ساتھ ظاہر وباطن کے درمیان فیصلہ کر دیتی ہے، کس میں کس قدر طاعت الٰہی کا جذبہ ہے پابندی نماز سے آپ ہی ظاہر ہوجاتا ہے، کس پر قرآن مجید کس قدر منکشف ہوا ہے، اس کے اسرار ومعانی سے کس قدر فائدہ ہوا ہے، قرآن رگ وپے میں کس قدر سرایت کر گیا ہے اس کی گواہی نماز دیتی ہے، یوں تو قرآن کا نام لے کر واویلا کرنے والے ہر دور میں ہیں، اس دور میں بھی قرآن کی رٹ لگانے والوں کی کمی نہیں مگر نماز وجماعت کی پابندی نعروں کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے، آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نماز تو لوگ دکھاوے کے لیے بھی پڑھ سکتے ہیں، تو واقعہ یہ ہے کہ دکھاوے کی نماز پر خود قرآن نے ملامت کی ہے اور ایسے ریاکاروں کو تباہی وبربادی کا مژدہ جانکاہ سنایا ہے جو خدا کے سامنے کھڑے ہوکر بھی اپنی شیطانی خصلت سے باز نہیں آتے، فرمایا ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ (۴) الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (۵) الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ (۶) (الماعون)

(ترجمہ: اور ایسے نماز ٹرخانے والوں پر لعنت ہے، جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ کامل مومن کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا، کہ نماز تو سبھی پڑھ سکتے ہیں، دکھانے کے لیے بھی پڑھ سکتے ہیں، لیکن کامیاب وہی ہو سکتا ہے جو کامل ہو، اور کامل وہ ہوگا جس کو قرآن کی ذکر کردہ خصوصیات حاصل ہوں اور ان خصوصیات کے ذکر میں پہلی خصوصیت نماز میں خشوع ہے۔

یہ خشوع آخر کیا چیز ہے، خشوع کے معنی ہیں کسی کے آگے جھک جانا، اظہار عاجزی، سکون وفروتنی اور تذلل وغیرہ کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ تذلل، سکون اعضاء، خوف، تواضع اور جمود کے لیے استعمال ہوا ہے، اصطلاحی طور پر الفاظ کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ متعدد تعریفات کی گئی ہیں، قلب کا پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ کے سامنے جھک جانا خشوع ہے، ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صفت خشوع مرکب ہے، تعظیم ومحبت اور تذلل وانکساری کا، (نضرۃ النعیم:۱۸۲۵۔ج۵)

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ نظر اور آواز کو پست

رکھنا خشوع ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ دائیں بائیں التفات یعنی گوشۂ چشم سے دیکھنے سے بچنا خشوع ہے، عطا کہتے ہیں کہ بدن کے کسی حصہ سے کھیل نہ کرنا خشوع ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ نماز میں خشوع مطلوب ہے، وہ ان سب معنی پر محیط ہے، دل غیر اللہ سے خالی ہو، پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو، بندہ اپنے کو پورے طور پر اللہ کے حوالے کر دینے کے احساس کے ساتھ کھڑا ہو، اس کی ہر ادا سے انکساری وعاجزی اور تواضع کا اظہار ہو رہا ہو، وہ عملا بھی ادھر ادھر التفات نہ کرے، اس لیے کہ نماز میں اللہ بندے کی طرف توجہ رکھتا ہے لیکن جب بندہ ادھر ادھر دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنا رخ پھیر لیتے ہیں :عن أبی ذرؓ عنی النبی ﷺ قال: ''لایزال اللہ عزو جل مقبلا علی العبد فی صلاتہ مالم یلتفت فإذا صرف وجهه انحرف عنه''.(مسند احمد ج۳۵/۲۱۵۰۸)

خشوع کا تعلق دل سے ہے، حضرت سعید بن المسیب نے ایک شخص داڑھی سے کھیلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اگر دل میں خشیت ہوتی تو اس کے اعضاء سے بھی خشوع کا اظہار ہوتا اور وہ پرسکون رہتے۔ حدثنا ابن علیة عن معمر عن رجل قال: رأى سعيد بن المسيب رجلاً وهو يعبث بلحيته فی الصلاة فقال: لو خشع قلب هذا لخشعت جوارحه.(المصنف لابن ابی شیبہ: ۶۸۵۴. ج۴).

حضرت عمر بن الخطابؓ نے ایک شخص کو نماز میں اپنی گردن جھکائے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اے گردن جھکانے والے اپنی گردن کو اٹھاؤ، خشوع گردن سے نہیں وابستہ ہے بلکہ خشوع کا تعلق دل سے ہے (نضرۃ النعیم ج۵،ص:۱۸۳۳)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسی کی تشریح میں فرمایا کہ مومنین جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو نظریں جھکا کر سجدے کی جگہ رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ دوران نماز اللہ تعالیٰ متوجہ ہوتے ہیں اس لیے وہ دائیں بائیں توجہ اور التفات نہیں کرتے۔(درمنثور ج۶،۸۴:)

دل اگر خاشع ہو جائے، وہ اگر حق کے تابع ہو جائے، اطاعت وخود سپردگی اس کا شعار بن جائے تو تمام اعضا سے نکلنے والے اعمال سے خشوع کا اظہار ہوتا ہے، ہر عمل خشیت الٰہی کے سبب درست ہو جاتا ہے، نماز میں کم ازکم اس قدر خشوع کا حصول ضروری ہے کہ دل میں بالقصد غیر اللہ کا خیال نہ لایا جائے اور اعضاء وجوارح کم ازکم فضول حرکتوں سے باز رہیں، خصوصیت کے ساتھ وہ حرکتیں سرزد نہ ہوں جن سے اجتناب کی جناب رسول ﷺ نے ہدایت کی ہے، اور فقہاء جنھیں مکروہات میں شمار کرتے ہیں۔ صاحب معارف القرآن لکھتے ہیں:

''امام غزالی وقرطبی اور بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ نماز میں خشوع فرض ہے، اگر پوری نماز خشوع کے بغیر گزر جائے تو نماز ادا ہی نہ ہوگی۔ دوسرے حضرات نے فرمایا کہ اس میں شبہ نہیں کہ خشوع روحِ نماز ہے اس کے بغیر نماز بے جان ہے مگر اس کو رکن نماز کی حیثیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خشوع نہ ہو تو نماز ہی نہ ہوئی اور اس کا اعادہ فرض قرار دیا جائے۔

حضرت سیدی حکیم الامہؒ نے بیان القرآن میں فرمایا کہ خشوع صحت نماز کے لیے موقوف علیہ تو نہیں اور درجہ میں وہ فرض نہیں مگر قبول نماز کا موقوف علیہ اور اس مرتبہ میں فرض ہے حدیث میں طبرانی نے معجم کبیر میں بسند حسن حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سب سے پہلے جو چیز اس امت سے اٹھ جائے گی یعنی سلب ہو جائے گی وہ خشوع ہے، یہاں تک کہ قوم میں کوئی خاشع نظر نہ آئے گا۔ کذا فی مجمع الزوائد''۔(معارف القرآن، ج۶،ص:۲۹۶)

ذرا تصور کیجئے کہ ہماری اوندھی ٹیڑھی نمازیں، جلد

بازی اور کسی کے خوف سے ادا کی گئیں نمازیں، ایک ڈیوٹی اور فارملٹی کے طور پر کھیل کرتے اور مٹکتے چٹکتے ادا کی گئی نمازیں کیا صفات کمال میں سے اس پہلی صفت سے متصف ہیں، کمال ایمان کی شرط اور علامت اول ''خشوع فی الصلاۃ'' کو یوں ہی نہیں قرار دیا گیا، اس کے حصول کے لیے کمال توجہ کی ضرورت ہے، صرف یہ صفت حاصل ہو جائے، تو پوری زندگی منظّم و مرتب ہو جائے، خشوع ایمان کا مظہر اور حسن اسلام کی دلیل ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کا خوف اور اس کی ہیبت دل میں پیدا ہوتی ہے، اس سے استقامت اور آدمی کی صالحیت کا اظہار ہوتا ہے، خشوع اللہ کی کامل بندگی کا اظہار اور اس کے ماسوا کا انکار ہے، یہ خشوع نماز کی قبولیت، جنت کے حصول اور فلاح مومن کا ذریعہ ہے، اس خشوع کے عطایا و برکات کا کیا کہنا، اس کی وجہ سے آدمی میں تواضع پیدا ہوتا ہے اور تواضع کی بنا پر خشوع کے باعث آدمی کے مراتب قیامت کے دن بلند کئے جائیں گے۔''عن عبد اللہ بن مسعود من تواضع للہ تخشعا رفعہ اللہ یوم القیامۃ ومن تطاول تعظما وضعہ اللہ یوم القیامۃ''. (نضرۃ النعیم ج۵،ص :۱۸۳۳)

سچی بات یہ ہے کہ دوران نماز اگر خشوع کی یہ مطلوب کیفیت حاصل ہوجائے تو پھر نماز کے باہر کی زندگی میں بھی ہر عمل سے اس کا اظہار ہوتا ہے، اور طاعت وعبادت آسان ہوجاتی ہے، آئندہ کی آیات میں مزید جن خصوصیات کا تذکرہ ہے ان کا حصول بھی آسان ہوجاتا ہے۔

لغویات سے اجتناب

کمال ایمان اور فلاح مومن کی دوسری خصوصیت کے طور پر ارشاد فرمایا گیا **والذین ھم عن اللغو معرضون** ذرا تصور کیجئے کہ یہاں قرآن مجید نے کیسا جامع لفظ اختیار کیا ہے، لغو کا لفظ ہر اس قول وفعل پر حاوی ہے جس میں گناہ ہو، یا گناہ نہ ہو مگر اس کا کوئی فائدہ اور کوئی نتیجہ نہ ہو، وہ فضول ولایعنی ہے، امام ابن کثیر اس لفظ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ لغو باطل کو کہتے ہیں، شرک اور دیگر معاصی پر بھی یہ لفظ حاوی ہے، ہر وہ قول وفعل اس میں داخل ہے جو فضول و بے فائدہ ہو، (ابن کثیر ج۳،ص:۳۱۸) ظاہر ہے کہ جب وہ قول وفعل لغو ہے جس میں اگر چہ گناہ نہیں مگر کوئی نتیجہ و فائدہ بھی نہیں تو پھر شرک اور وہ اعمال جو گناہ ہیں ان پر تو بدرجہ اولی یہ لفظ صادق آتا ہے۔

لغو کا سب سے بڑا درجہ شرک ہے جس سے پرہیز ہر حال میں لازم ہے، اور جس کی معافی کا بھی کوئی امکان نہیں، پھر وہ گناہ ہیں جن کا توبہ سے معاف ہونا ممکن ہے، جن میں کوئی فائدہ ہونا تو دور صرف گناہ ہی گناہ لازم آتا ہے، وہ سب لغو کے اعلی درجہ میں آتے ہیں، لغو کا ادنی درجہ یہ ہے کہ انسان ایسے اقوال واعمال میں مشغول رہے جسمیں کوئی گناہ نہ ہو، مگر کوئی فائدہ بھی نہ ہو، ظاہر ہے کہ کمال ایمان کی جب یہ علامت قرار دی گئی ہے تو اس ادنیٰ درجہ سے بھی حتی المقدور پرہیز لازم ہے، حضرت رسالت مآب نے اس بات کو ایک چھوٹی سی حدیث میں یوں بیان فرمایا ہے: کسی شخص کے اسلام کے اچھا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ فضول اور لایعنی باتوں سے اجتناب کرے۔ **عن أبی ھریرۃؓ قال : قال رسول ﷺ من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ** .(جامع الترمذی، ج۴:۲۳۱۷)

پھر مومن کی شان بھی یہی ہے کہ وہ معرکہ حیات اور کارگاہ عمل میں ہر دم رواں دواں اور مستعد رہتا ہے، ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات کے ساتھ محاسبہ نفس اس کا مطمح نظر ہے، وہ امتحان ہال میں ہمہ وقت آخرت کی تیاری میں مصروف ہے، اسے ہر وقت اپنے فرائض وواجبات اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے، اس کو کہاں چھٹی ہے جسے

سبق یاد ہو، وہ تو ہر وقت اپنے فائنل اگزام کی تیاری میں مصروف ہے، اسی لیے اسے لغویات یعنی لایعنی اور فضول باتوں سے پرہیز کا حکم ہے، اس کی شان اور اس کی عادات و اخلاق کا یہ حصہ ہے کہ وہ لغو مجلسوں اور لغو کاموں سے منہ پھیر کر گزر جائے، قرآن خود کہتا ہے:"وإذا مروا باللغو مروا كراماً" (الفرقان: ۷۲) جب مومنین کا گزر کسی ایسی جگہ سے ہوتا ہے جہاں لغویات ہوں تو وہاں سے بڑے مہذب انداز میں آگے بڑھ جاتے ہیں، پھر اس کے نتیجہ میں ان کو جس جنت کی بشارت دی گئی ہے اس کی خصوصیات میں بھی یہ فرمایا گیا ہے؛"لاتسمع فيها لاغية" (الغاشية: ۱۱) جنت میں آپ فضول باتیں نہیں سنیں گے۔

مختصر یہ کہ مومن کی پاکیزہ سوچ، پاک دل اور پاک طینتی کو یہ کہاں برداشت کہ وہ لغویات اور گندگی سے قریب رہے، اگر واقعی یہ نفسیات پیدا ہو جائیں تو سوچئے دینی ودنیاوی بہر اعتبار ہم کس قدر فائدہ میں رہیں گے، ذرا احتساب کیجئے، روزمرہ کی زندگی کا، ہم اپنی عمر کا کتنا حصہ فضول باتوں اور لغو کاموں میں گزارتے ہیں، بلکہ بسا اوقات لغویات کی تیاری میں بہت سا وقت گزار دیتے ہیں، اگر لغویات سے پرہیز کی عادت پڑ جائے تو نہ صرف یہ کہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہوگا، بلکہ ہم اپنی ذامہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کر سکیں گے، ہمارے وقت میں، مال میں اور اعمال میں برکت نظر آئے گی۔

صاحب تدبر نے یہاں بہت بلیغ نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

''یہ زندگی پر نماز کا اثر بیان ہوا ہے۔''لغو'' سے مراد ہر وہ قول وفعل ہے جو زندگی کے اصل مقصود ___ رضائے الہی ___ سے غافل کرنے والا ہو۔قطع نظر اس سے کہ وہ مباح ہے یا غیر مباح۔جس نماز کے اندر خشوع ہو اس کا اثر زندگی پر لازماً یہ پڑتا ہے کہ فضول، غیر ضروری، لایعنی، بے مقصد چیزوں سے آدمی احتراز کرنے لگتا ہے۔اس کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اگر میں نے کوئی فضول قسم کی حرکت کی تو اپنے عالم الغیب مالک کو ایک روز منہ دکھانا ہے اور اس چیز کی شب وروز میں کم از کم پانچ بار اس کو یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔ظاہر ہے کہ جس شخص کا ضمیر اتنا بیدار اور حساس ہو کہ ہر غیر ضروری حرکت سے اس کی طبیعت انقباض محسوس کرے وہ کسی بڑی بے حیائی اور برائی کا مرتکب کبھی مشکل ہی سے ہوگا۔نماز کا زندگی پر یہی اثر سورۂ عنکبوت میں یوں بیان ہوا ہے :"إن الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر۔ (نماز بے حیائی اور ناپسندیدہ باتوں سے روکتی ہے)روکنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ ایک نہایت ہی موثر واعظ وزاجر ہے جو شب وروز میں پانچ مرتبہ انسان کو تذکیر کرتی رہتی ہے کہ دربار الٰہی کے شایان شان اعمال وکردار کیا ہیں اور انسان کو کہاں جانا ہے اور اس کے لیے اس کو کیا تیاریاں کرنی چاہئیں اور اپنے آپ کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہئے''۔(تدبر قرآن، ج۵ص:۲۹۶۔۲۹۷)

زکوۃ کی ادائیگی

مومن کامل کی تیسری صفت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:"والذين هم للزكوٰة فاعلون" زکوٰۃ کے معنی لغت میں تطہیر یعنی پاک کرنے کے ہیں، اصطلاح شریعت میں مال کا ایک خاص حصہ مقرر شرطوں کے ساتھ مستحقین تک پہنچانے کو زکوٰۃ سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہاں اس کے یہی معنی مراد لیے جا سکتے ہیں، اس لیے کہ قرآن مجید میں عام طور پر یہ لفظ اسی معنی کے لیے استعمال ہوا ہے، اگر ان آیات کے مجموعہ کو سامنے رکھا جائے جن میں یہ لفظ مستعمل ہے تو یہ بھی واضح ہوگا کہ اس کا مفہوم عام طور پر انفاق فی سبیل اللہ ہے، یہ کہنا کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی اور زکوٰۃ کی فرضیت مدینہ میں آئی اس

لیے صحیح نہیں کہ سورۂ مزمل مکی ہے، اور اس میں بھی "أقیموا الصلاۃ واٰتوا الزکوٰۃ" موجود ہے، جس سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت تو نازل ہوگئی تھی مگر اس کے متعلق تفصیلات مدینہ میں نازل ہوئیں، پھر یہ کہ متعدد مکی آیات میں اقامت صلاۃ کے ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا تذکرہ ہے۔

کچھ لوگ اس کو مصدری معنی میں لیتے ہیں اور اس سے مراد تزکیہ لیتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ اس سے زکوٰۃ کے اصطلاحی معنی ہی مراد ہیں، اس میں فرض زکوٰۃ کے معنی تو ہیں ہی، انفاق فی سبیل اللہ اور تزکیہ ضمنا شامل ہیں، زکوٰۃ مال کی تطہیر کے ساتھ نفس کی تطہیر کا بھی ذریعہ ہے، راہ خدا میں اپنا کمایا ہوا مال دینا آسان نہیں، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجئے جو تفسیر کی کتابوں میں ایک مشہور واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک شخص ثعلبہ بن حاطب نے آنحضرت ﷺ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس کے مالدار ہونے کی دعا کریں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کو میرا طریقہ پسند نہیں، خدا کی قسم اگر میں خواہش کرتا تو مدینہ کے پہاڑ میرے ساتھ سونا بن کر چلتے مگر مجھے ایسی مالداری پسند نہیں، مگر اس شخص نے دوبارہ حاضر ہوکر اپنی درخواست دوہرائی اور اس مرتبہ آنحضرت ﷺ نے دعا فرمادی، آپ ﷺ کی دعا کے نتیجہ میں وہ مالدار ہوگیا، اس کے مال کی کثرت نے اس کو مدینہ سے اتنی دور پہنچادیا کہ وہ جمعہ اور جماعت سے بھی محروم ہوگیا اور ایک موقع پھر وہ آیا جب حضور ﷺ کے عاملین زکوٰۃ صدقات کی وصولیابی کے لیے گئے اور رسول اللہ ﷺ کا فرمان دکھایا، تو اس نے کہا یہ تو جزیہ ہوگیا، جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، اس نے اس وقت عاملین کو ٹال دیا اور کہا کہ آپ اپنا کام کریں جب وصول یابی کے بعد واپس ہوں تو ہم سے ملئے، جب دوبارہ یہ لوگ آئے تو اس نے قانون صدقات دیکھنے کا مطالبہ کیا اور پھر یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں کوئی فیصلہ کروں گا تو بتاؤں گا ابھی آپ لوگ جائیں، اس کے برخلاف ایک شخص سلیمی نے جب یہ حکم سنا تو نصاب کے مطابق خود بہترین جانور لے کر عاملین کے پاس پہنچ گئے، عاملین نے کہا ہمیں چھانٹ کر لینے کا حکم نہیں ہے بلکہ متوسط جانور لینے کی اجازت ہے، سلیمی نے اصرار کیا کہ میں اپنی خوشی سے پیش کررہا ہوں آپ قبول فرمالیجئے۔

رسول اللہ ﷺ کو جب یہ دونوں کا حال معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے سلیمی کے لیے دعا فرمائی اور ثعلبہ پر سخت افسوس کا اظہار کیا، ابن جریر طبری نے آگے تفصیل ذکر کی ہے کہ ثعلبہ کو جب حضور کے اظہار افسوس کی خبر ملی تو حاضر ہوا مگر آنحضرت ﷺ نے اس کا صدقہ قبول نہیں کیا کیوں کہ آپ ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے دل میں نفاق ہے اور یہ سچی توبہ نہیں کررہا ہے، آپ ﷺ کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے بھی اس کا صدقہ قبول نہیں کیا، حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کا انتقال اسی حال میں ہوا۔ (ملخص: تفسیر طبری، ج۹ص: ۲۲۰)

لہذا اصطلاحی زکوٰۃ میں انفاق فی سبیل اللہ پر ابھارنا، مال ونفس کو پاک کرنا اور جذبۂ شکرگزاری اور طیب نفس کے ساتھ خالص رضائے الٰہی کے لیے اپنے مال کا ایک حصہ نکالنا سب شامل ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی کو بار بار نماز کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی نماز کے اثرات کی اولین مظہر ہے، اگر نماز میں خشوع حاصل ہوتا ہے تو دل طاعت پر آمادہ ہوتا ہے اور پھر اپنے مال کی محبت میں کمی آتی ہے اور ایک متعین مقدار کا بطور زکوٰۃ نکالنا آسان ہوتا ہے۔ اس بات کو اس سے تقویت پہنچتی ہے کہ جہاں پر ریاکاری کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو ملامت کی گئی ہے وہاں ان کی ریاکاری کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ اگر ان سے روزمرہ کے استعمال کی معمولی چیزیں مانگی جائیں تو بھی وہ

منع کر دیتے ہیں۔"فويل للمصلين الذين هم عن صلاتهم ساهون الذين هم يراؤن ويمنعون الماعون"(الماعون: ۴۔۷) اس میں کیا شک کہ نماز اگر مجسم شکر گزاری ہے تو زکوٰۃ بھی جذبہ شکر گزاری کا اظہار ہے، اسی لیے دیکھا گیا ہے کہ جب مومن کو خشوع حاصل ہوتا ہے تو اگر چہ وہ اصطلاحی زکوٰۃ ادا کرنے کے لائق نہ ہو مگر کار خیر میں حسب استطاعت خرچ کرنے سے گریز نہیں کرتا، اپنی حیثیت کے مطابق وہ صدقہ کرتا رہتا ہے، اگر وہ کیفیت حاصل ہوجائے جو خرچ کرنے پر ابھارتی ہے تو مال نہ ہونے پر بھی صدقہ کی فکر ہوتی ہے، اور وہ کیفیت حاصل نہ ہو تو مال ہونے پر بھی خرچ کی ہمت نہیں ہوتی۔

حدیث مرفوع میں ہے، حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ کو فرماتے ہوئے سنا، آپؐ نے ارشاد فرمایا: کہ صدقہ کیا کرو خواہ ایک کھجور کیوں نہ ہو، کیوں کہ صدقہ بھوکے کا سہارا بنتا ہے، صدقہ خطاؤں کو ایسے ہی ختم کر دیتا ہے جیسے پانی آگ کو بجھا دیتا ہے۔قال رسول الله ﷺ تصدقوا ولو بتمرة فانها تسد من الجائع وتطفئ الخطيئة كما يطفئ الماء النار. ایک اور روایت میں ہے کہ اگر کوئی ایک کھجور کے بقدر بھی اپنی پاکیزہ کمائی میں سے صدقہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے، (متفق علیہ)

زکوۃ کی ادائیگی سے اگر خالق ومخلوق کا تعلق بڑھتا ہے تو خود بندوں کے درمیان بھی اس کی ادائیگی سے ربط وتعلق استوار و مستحکم ہوتا ہے۔عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اللہ تعالی زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنے والے کی نماز نہیں قبول کرتا، پھر فرمایا کہ اللہ ابوبکرؓ پر رحم کرے کتنے فقیہ شخص تھے کہ انھوں نے مانعین زکوٰۃ سے جنگ کی :قال عبد الرحمن بن زيد بن اسلم "أبى الله أن يقبل الصلاة إلا بالزكاة، وقال يرحم الله أبابكر ماكان أفقهه يعني لما قاتل ما نعي الزكاة"(نضرة النعيم ،ج۶: ۲۲۱۵)

اب ذرا معاشرہ پر نظر ڈالئے اول تو یہ دیکھیے کہ زکوٰۃ نکالتے ہی کتنے لوگ ہیں؟ پھر جو نماز پڑھتے ہیں ان میں سے کتنے لوگ نکالتے ہیں؟ پھر جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں؟ ان میں سے کتنے لوگ ہیں جو بغیر حیل و حجت کے پوری امانت داری کے ساتھ اپنے پورے مال کی زکوٰۃ نکالتے ہیں؟ کچھ مقدار نکال دی اور سمجھ لیا کہ ہم فرض کی ادائیگی سے فرصت پا گئے، اس صورت میں پوری زکوٰۃ ہرگز ادا نہیں ہوتی۔

ذرا سوچئے کہ جس چیز کو قرآن نے کمال ایمان کی علامت قرار دیا ہے اس کے ثمرات کس قدر کثیر اور اثرات کس قدر دوررس اور وسیع ہیں، وہ ظاہر و باطن کے تزکیہ کا کیسا مظہر ہے اور کیسی واضح علامت ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی سے مال پاکیزہ ہورہا ہے، نفس حرص وطمع سے نجات پا رہا ہے، کمال ایمان کی علامت ظاہر ہورہی ہے، فقراء ومساکین کی ضروریات پوری ہونے کے ساتھ ان کی دلبستگی کا سامان ہورہا ہے، اجتماعی اور معاشرتی تعلقات کو تقویت مل رہی ہے، زکوٰۃ کا ایک بڑا فائدہ یہ ملتا ہے کہ باہمی بغض وحسد ختم ہوتا ہے اور جذبہ رحم کو فروغ ملتا ہے، زکوٰۃ کی ادائیگی کے سبب خود صاحب مال کے اموال میں برکت ہوتی ہے اور پھر معاشرہ میں برکتوں کا ایسا ظہور ہوتا ہے کہ پورا معاشرہ امن وسکون کا گہوارہ بن جاتا ہے۔

شرمگاہ کی حفاظت

کمال ایمان اور فلاح حقیقی کی چوتھی علامت کے طور پر شرمگاہوں کی حفاظت کا ذکر کیا گیا، فرمایا گیا کہ "والذين هم لفروجهم حافظون" یعنی جو کمال ایمان سے متصف فلاح حقیقی پانے والے ہیں، ان کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہاں

حرام طریقوں سے شہوت کی تسکین نہ کرنے کا تذکرہ ہے تو ظاہری طور پر شرمگاہوں کو چھپانا، ڈھالنا اور پوری طرح ان کو پردہ میں رکھنا بدرجہ اولیٰ اسمیں داخل ہے، کوئی بھی حرام طریقہ ہو اس کے ذریعہ قوت شہوانی کی تسکین سے پرہیز کی بات کی گئی ہے صرف "إلا على أزوجهم أو ماملكت ايمانهم" یعنی بیوی یا شرعی لونڈی سے شہوت پوری کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

چونکہ دین اسلام فطرت کے عین مطابق ہے، وہ اگر ایک چیز سے روکتا ہے تو دوسری چیز کا حکم دیتا ہے، بشری تقاضے اور فطری خواہشات کی اس دین میں مکمل رعایت رکھی گئی ہے، ایک طرف اگر اس دین میں زنا، محرمات سے نکاح، اغلام بازی، استمنا بالید اور زنا کے دیگر تمام طریقوں سے شہوت پوری کرنے پر روک لگائی گئی تو دوسری طرف فطری خواہش پوری کرنے کے لیے نکاح شرعی کے تحت مردوں کے لیے نکاح میں آئی عورتوں اور عورتوں کے لیے نکاح میں آئے مردوں سے جنسی تعلقات قائم کرنے کا جواز فراہم کیا، "فإنهم غير ملومين" کے عجیب وغریب انداز بیان سے قرآن نے بڑا ابلغ اشارہ کیا کہ شرعی بیوی اور شرعی لونڈی سے بشری تقاضہ پورا کرنے میں ملامت نہیں، یہ قطعاً زہد وتقوی کے خلاف نہیں، اسلام میں رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی، اس لیے نکاح کو زہد وتقوی کے خلاف سمجھنا درست نہیں، البتہ مومن پر قوت بہیمیہ کا غلبہ ہو یہ بھی پسندیدہ نہیں، وہ جنسی تسکین کو ہی مقصد زندگی بنا لے یہ بھی اس کی شان نہیں، مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

"یعنی شرعی قاعدے کے مطابق اپنی بیوی یا لونڈی سے شہوت نفس کو تسکین دینے والوں پر کوئی ملامت نہیں، اس میں اشارہ ہے کہ اس ضرورت کو ضرورت کے درجہ میں رکھنا ہے مقصد زندگی بنانا نہیں، اس کا درجہ اتنا ہی ہے کہ جو ایسا کرے وہ قابل ملامت نہیں۔ واللہ اعلم"۔ (معارف القرآن، ج۶ص:۲۹۷)

آگے قرآن مجید نے دوٹوک لفظوں میں واضح کردیا **فمن ابتغى وراء ذالك فأولٰئك هم العٰدون** کہ شہوت رانی کے جوحدود متعین کئے گئے ہیں ان سے تجاوز کرنے والے، جو طریقے متعین کئے گئے ہیں ان طریقوں کو چھوڑ کر دوسرے طریقوں سے تسکین حاصل کرنے والے ہی دراصل حدود کو توڑنے والے ہیں، اللہ کی شریعت سے بغاوت کرنے والے ہیں، قرآن مجید کے ان الفاظ نے شہوت رانی کے مشروع طریقہ کے علاوہ ہر طریقہ کو حرام کردیا، رسول پاک علیہ السلام نے جائز طریقہ کو آسان بنا کر زنا اور دواعی زنا سے بچنے کی تلقین فرمائی، فی الحقیقت نکاح کو اس قدر آسان بنا دینا چاہئے کہ زنا مشکل و ناپید ہو جائے، حضور ﷺ نے اس کو صحیح معنی میں آسان بنایا تھا، ولیمہ کو مسنون کیا تھا خواہ ایک بکری سے کردیا جائے، مگر آج ہم نے بے جا لوازمات اور فضول اخراجات سے اس کو مشکل بنادیا ہے۔

حدیث میں فرمایا گیا کہ سب سے زیادہ برکتوں والا نکاح وہ ہے جس میں خرچ کم کیا گیا ہو، "**عن عئشةؓ قال: قال النبیﷺ إن أعظم النكاح بركة أيسره مؤنةً**" (رواه البيهقي: في شعب الايمان ۷۳۰۹۷) یہ ہدایت دی گئی کہ جو نان ونفقہ کی ذمہ داری اٹھا سکتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ نکاح کرے، قرآن مجید نے ایک طرف تو پردہ کے سخت اور قابل عمل حدود متعین کئے اور دوسری طرف نکاح کا حکم دیا، سورۃ النور جو پوری کی پوری عفت اور پاکدامنی اور عصمت کی حفاظت کے مضامین پر مشتمل ہے اس میں یہ بات بھی صاف کردی گئی کہ اگر نکاح کا پیغام دینے والے فقرا ہوں، غریب ہوں تو انکار نہ کرنا چاہئے بشرطیکہ ان میں کمانے کی صلاحیت موجود ہو، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے مالدار

کردے گا، ارشاد ہے:

وَأَنكِحُوا الْأَيَامَى مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاء يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِه(النور: ۳۲)

(ترجمہ: تم میں جو غیر شادی شدہ ہیں (مرد یا عورت)اور تمہارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نیک صالح ہیں، ان کی شادی کردو، اگر وہ تنگدست ہوں (تو اس کی وجہ سے تاخیر نہ کرو) اللہ ان کو اپنے فضل سے خوشحال کردے گا،)

نکاح واجب ہے یا سنت، یہ ائمہ مجتہدین کی اختلافی بحث ہے، مختلف حالات میں حکم بھی مختلف ہے، مگر اس پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ جس شخص کے نکاح نہ کرنے کی صورت میں گناہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو اس پر واجب ہے کہ نکاح کرے ورنہ وہ نکاح نہ کرنے کی پاداش میں گناہگار ہوتا رہے گا ، برا ہو مغربی شیطان کا جس نے Establishment کی اصطلاح کو فروغ دے کر نکاح کو مؤخر کرنے کی عادت ڈال دی اور شہوت رانی کے متعدد و دیگر راستے کھول دیئے، ہم نے بچشم خود مغرب و مشرق کے تصورات کے حامل اداروں میں رہ کر دیکھا ہے، آج نکاح میں تاخیر اور تعلیمی اداروں اور گھروں میں بے مہابا اختلاط نے زنا یا مقدمات زنا کو جس جس طرح فروغ دیا ہے، اس کا اندازہ وہ نہیں کرسکتا جس نے دنیا نہ دیکھی ہو یا جو احساس کی دولت سے بے بہرہ ہو، اس پر مستزاد موبائل ، انٹرنیٹ اور تربیت کے فقدان نے اس حمام میں سب کو برہنہ کردیا ہے، اگر کوئی واقعی فلاح حقیقی کا طلبگار ہے تو اسے شرمگاہوں کی بہر معنی حفاظت کا عادی بننا پڑے گا، شرمگاہوں کی حفاظت کے لیے ضروری ہے کہ نکاح آسان تھا اسے آسان بنایا جائے، ''يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِه'' پر یقین رکھا جائے اور ''اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے مغربی تصور کو'' اتار پھینکا جائے ، کسب معاش ، اور نان ونفقہ اسلام میں ضرورت ہے، بقدر کفاف ضرورت ہر شخص پوری کر رہا ہے، مولویوں اور مزدوروں سے زیادہ تکمیل ایک ضرورت کی حقیقت سے کون واقف ہوگا، اس کے برخلاف مغربی تصور میں ضرورت کو خواہشات اور عیش پرستی میں تبدیل کردیا گیا جس کے نتیجہ میں بے پناہ مفاسد پیدا ہوگئے ہیں ، خود ہم نے بھی (جنہیں دیندار کہا اور سمجھا جاتا ہے) نکاح مسنون کو متعدد لوازمات سے جوڑ کر مشکلات کا مرکب بنادیا ہے، اس کو ایک معاشرتی ضرورت سمجھ کر آسان تر کیا جائے ، اس کے ساتھ ساتھ پردہ کی تلقین کی جائے ، ہر اس شخص سے فاصلہ رکھا جائے اور احتیاط برتی جائے جس سے نکاح جائز ہو، ہندوستانی سوسائٹی میں ایک بڑا فساد جو ظاہر ہو رہا ہے وہ ایسے رشتوں پر اعتماد کرنے اور انہیں بھائی بہن کا نام دینے کے سبب ظاہر ہو رہا ہے ،جن کا آپس میں نکاح درست ہے اور جو قطعا بھائی بہن نہیں ہو سکتے ، خالہ زاد، ماموں زاد، چچا زاد، پھوپھی زاد کے لیے عربی میں کوئی لفظ نہیں ابن العم اور ابن الخال کا ترجمہ چچا زاد بھائی اور ماموں زاد بھائی ہرگز نہیں ہوسکتا، یہ خالص ہندوستانی تصور ہے، جو معاشرتی فساد کا حصہ ہے، اس پر کنٹرول ان اسباب پر کنٹرول کا ایک جزء ہے، جن سے حرام کاری اور گناہ کا ارتکاب ہوسکتا ہے، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جنسی تلذذ کا کوئی بھی غیر شرعی طریقہ خواہ وہ ذہنی، لسانی یا جسمانی ہو سب حرام ہے اور ایسا کرنے والا اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے والا باغی قرار پائے گا۔

امانت داری وایفائے عہد

اس کے بعد کی آیت میں دو صفات کا ذکر گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُون﴾ یعنی پانچویں صفت امانتداری اور چھٹی خصوصیت عہد کی پابندی ذکر کی گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں خصوصیات میں پوری

حیات انسانی اور اس کے دونوں حصوں یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت کرنے اور خالق ومخلوق سے کئے ہوئے عہد وپیمان کو پورا کرنے کا حکم دے دیا گیا، بلکہ یوں کہیے کہ اس اجمالی حکم میں حیات انسانی کی تمام تفصیلات کو سمیٹ دیا گیا۔

حضور اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرما دیا کہ اس شخص کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں جس میں امانت داری نہیں اور اور اس شخص کے دین کا کوئی اعتبار نہیں جس میں پابندی عہد کی خو نہیں۔ **عن أنس بن مالک ؓ قال: ما خطبنا نبی إلا قال: لا إیمان لمن لا أمانة له ولا دین لمن لا عهد له.** (رواه احمد: ۱۲۳۸۳ ج ۱۹)

امانت کا لفظ تمام شرعی، قانونی اور اخلاقی ذمہ داریوں پر محیط ہے، عموماً معاشرہ میں امانت کا مطلب یہ تصور کیا جاتا ہے کہ کسی کے مال میں کوئی خیانت کرے تو امانت میں خیانت ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خداوند قدوس نے جو چیزیں فرض اور واجب قرار دی ہیں ان میں کوتاہی کرنا بھی خیانت ہے، کسی نے کوئی چیز رکھوائی ہو، کوئی راز سپرد کیا ہو تو اس میں خرد برد بھی خیانت ہے، امانت کا تعلق عزت، مال، اولاد، جسم وروح، علوم ومعارف اور کتابت، قلم، شہادت ووصیت، رازداری وپیغام رسانی سب سے ہے، اللہ تعالیٰ نے یہاں جمع کا صیغہ ہی اس لیے استعمال فرمایا ہے کہ یہ ہر طرح کی امانت داری پر حاوی ہے، اس میں امانت کی سب ہی قسمیں آ گئی ہیں، امانت کا تعلق حقوق اللہ سے بھی ہے، فرائض و واجبات کی ادائیگی اور محرمات ومنکرات ومکروہات سے اجتناب عین امانت داری ہے، اس کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے، کسی کی بطور امانت رکھوائی گئی چیز تو امانت ہے ہی، کسی کا راز بھی امانت ہے، ملازمت بھی امانت ہے، ملازمتی، دفتری، گھریلو ذمہ داری امانت ہے، قرآن مجید میں لفظ امانت کو ان سب معانی میں استعمال کیا گیا ہے، سورہ نساء کی آیت **إن الله یأمرکم أن تؤدوا الامانات إلی أهلها** (نساء ۵۸) کے ضمن میں جو واقعہ نقل کیا گیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ ایک کنجی بھی امانت تھی، ذرا اس روایت پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کس حد تک امانت داری نبھانے کی تاکید کی گئی ہے:

''صاحب مظہری نے مجاہد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے عثمان بن طلحہ سے بیت اللہ کی چابی لی اور اندر داخل ہوئے، تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ اس آیت کی تلاوت کرتے ہوئے باہر تشریف لائے، عثمان بن طلحہ کو بلایا اور بیت اللہ کی چابی عطا کی، آپ نے قرآن کے حکم **إن الله یأمرکم أن تؤدوا الامانات إلی أهلها** کی رعایت کی اور کنجی ان ہی کو واپس کر دی جبکہ حضرت عباس ؓ اور حضرت علی ؓ اس کا مطالبہ کرتے رہے تھے کہ بیت اللہ کی دوسری خدمات سدانہ وسقایہ ہمارے خاندان میں ہیں تو کنجی رکھنے کا شرف بھی ہم کو بخشیں، آپ ﷺ نے ان حضرات کی درخواست رد کر دی، ہجرت سے قبل ایک مرتبہ ان ہی عثمان بن طلحہ نے آنحضرت ﷺ کو خانہ کعبہ میں داخل ہونے سے روکا تھا اور بڑے سخت و درشت تیور دکھائے تھے، آپ ﷺ نے ان کی ترشی کو برداشت کرتے ہوئے کہا تھا عثمان شاید ایک روز تم یہ چابی میرے ہاتھ میں دیکھو گے اور اس وقت مجھے اختیار ہوگا کہ جس کو چاہوں دے دوں، اس موقع پر آپ ﷺ نے ان کو کنجی دی اور اس گفتگو کا حوالہ دیا، انہوں نے اس کی تصدیق کی اور کہا کہ آپ ﷺ کا ارشاد پورا ہوا، پھر مسلمان ہو گئے، آپ ﷺ نے اس موقع پر ان سے یہ بھی فرمادیا کہ یہ کنجی تا قیامت تمہارے خاندان میں رہے گی اور جو تم سے یہ لے گا وہ ظالم ہوگا'' (ملخص: تفسیر مظہری۔ ج ۲، ۳۶۲)

امام ابن الجوزی بعض مفسرین سے نقل کرتے

ہوئے فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں امانت کا استعمال تین معنی میں ہوا ہے۔

سورہ انفال میں یہ فرائض کی ادائیگی کے لیے آیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَخُونُواْ اللّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُواْ أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ(الانفال :۲۷)

(ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ اور رسول کے ساتھ جانتے بوجھتے خیانت نہ کرنا، اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرنا۔

سورۂ نساء میں اس کا استعمال کسی کے پاس رکھی گئی امانت کے لیے ہوا ہے:

إِنَّ اللّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤدُّواْ الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُواْ بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُم بِهِ إِنَّ اللّهَ كَانَ سَمِيعاً بَصِيراً (النساء:۵۸)

(ترجمہ: اللہ تمہیں اس اس کا حکم دیتا ہے، کہ امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچادو، اور لوگوں کے درمیان جب بھی فیصلہ کرو، تو عدل وانصاف سے کرو، اللہ تم کو اس کی بہترین نصیحت فرماتا ہے، بے شک اللہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔)

سورۂ قصص میں اس کا استعمال عصمت کی حفاظت کے لیے ہوا ہے:

قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ. (القصص: ۲۶)

(ترجمہ: دونوں بیٹیوں میں سے ایک نے والد صاحب سے کہا کہ ان کو اجرت پر رکھ لیجئے، سب سے بہتر ملازم وہ ہوتے ہیں جو طاقتور ہوں، امانتدار ہوں۔

جہاں تک عہد کا تعلق ہے تو اس سے مراد معاہدہ بھی ہے اور وعدہ بھی، دونوں کو پورا کرنا شرعاً لازم ہے، البتہ معاہدہ جو جانبین وطرفین میں ہو اس کی خلاف ورزی میں ایک فریق کو دوسرے کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے، اگر کوئی اگر اپنے کئے ہوئے وعدے سے مکر جائے تو شرعاً درست نہیں اور ایسا کرنے والا گناہگار ہے، مگر اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی اجازت نہیں، قانون سے ہٹ کر نبی کریم ﷺ کا فرمان دیکھئے اور سر دھنئے کہ یہ دین محض قانون نہیں بلکہ اس کی صفت خشوع، خشیت اور امانت داری وکی پابندی عہد کا پابند ومطہر ہے، چنانچہ وعدہ کے سلسلہ میں یہ سمجھنا چاہئے کہ وعدہ ایک طرح کا قرض ہے، جس طرح قرض کی ادائیگی واجب ہے اسی طرح وعدہ وفا کرنا واجب ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ امانت وعہد کو اگر فلاح حقیقی اور کمال ایمان کی علامت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے تو اس میں کس قدر وسعت وبلاغت ہے، اور یہ کس طرح پوری زندگی پر محیط ہے، اس کا مظہر وہ نماز بھی ہے جو کم از کم دن میں پانچ مرتبہ امانت داری اور پابندی عہد کی ضمانت دیتی ہے، لغویات سے اجتناب بھی اس کا مظہر ہے کہ وقت ایک امانت ہے، اور محرمات وباطل سے بچنا امانت ہے، اس کا مظہر وہ زکوٰۃ بھی ہے جس کی ادائیگی یہ بتاتی ہے کہ مال بندے کے پاس اللہ کی امانت ہے، وہ صرف اس مال کا وکیل ہے اصل مالک تو اللہ ہے، پھر اس فرض کی ادائیگی بھی امانت ہے، شرم گاہ کی حفاظت خود امانت داری کا ایک واضح مظہر ہے، امانت دار اور وعدہ وفا کرنے والا اللہ کی نظر میں بھی محبوب ہے اور لوگوں کی نظر میں بھی محترم ومکرم اور مقبول ومحبوب ہوتا ہے، امانت داری معاشرے میں خیر وبرکت کا سبب بنتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ دونوں صفتیں کمال ایمان کی علامت اور فلاح آخرت کی ضمانت ہیں۔

نماز کی پابندی

ساتویں صفت کے طور پر پھر نماز کو ذکر کیا گیا،

کامیابی کی علامات وصفات کا بیان نماز کے خشوع سے شروع کیا گیا اور نماز کی پابندی پر ختم کیا گیا، فرمایا گیا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ وہ مومنین جو اپنے ایمان کامل کے سبب فلاح حقیقی سے باریاب وسرفراز ہوں گے ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر نماز کی پابندی کرتے ہیں اور اس کو اس کے مستحب وقت میں پڑھتے ہیں، نماز میں ٹال مٹول نہیں کرتے، اس کو اپنی سہولت کے اعتبار سے مقدم ومؤخر نہیں کرتے، بلکہ ان کے دل تو نماز میں ہی اٹکے رہتے ہیں، وہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے منتظر رہتے ہیں، اس طرح وہ نماز کی پابندی بھی کر لیتے ہیں اور نماز کے وقت پر اس کی ادائیگی بھی ہو جاتی ہے، اور اس آیت کی بیان کردہ خصوصیت انہیں حاصل ہو جاتی ہے۔

غور کیجئے تو اندازہ ہوگا جہاں خشوع کا ذکر مقصود تھا وہاں نماز کا صیغہ صلوٰۃ واحد (Singular) لائے اور جہاں حفاظت نماز کا موضوع مطلوب تھا وہاں صلوات (Plural) لائے، مطلب یہ ہوا کہ خشوع ہر نماز میں مطلوب ہے، خواہ فرض ہو، واجب ہو، سنت ہو یا نفل ہو، نماز اگر پڑھی جائے تو خشوع کے ساتھ پڑھی جائے، صلوات کا صیغہ جمع لاکر یہ واضح کر دیا گیا کہ اس سے پانچوں نمازوں کی پابندی مراد ہے، یحافظون (یعنی حفاظت کرتے ہیں) اس لفظ سے یہ مفہوم واضح کیا گیا کہ کامل مومنین نماز کی حفاظت اس طرح کرتے ہیں کہ اس کو اس کے وقت مستحب میں ادا کرتے ہیں، نماز کی سنتوں، اس کے ارکان واجزا کا اہتمام کے ساتھ خیال کرتے ہوئے ادا کرتے ہیں، ان کا نماز پڑھنا فارمل ڈیوٹی نہیں ہوتی، بلکہ اپنے رب سے ملاقات کا ذریعہ ہوتی ہے، وہ "أن تعبد الله كأنك تراه وإن لم تراه فإنه يراك" کے اعلیٰ تصور یا دوسرے درجہ میں اس تصور کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑے ہیں۔

اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ نماز اصل ہے، یہی دین کی روح اور دینداری اور تمام اخلاق واعمال کے تزکیہ کا اصل آلہ ہے، گویا نماز قوام ایمان ہے، اس کے بغیر دیگر اعمال کے اچھے ہونے کا تصور عبث ہے، بڑی اچھی بات لکھی ہے صاحب تدبر قرآن نے:

''یہ بات کہ نماز ہی تمام دین کی محافظ ہے، قرآن میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے، ہم نے دوسرے مقام میں ان تمام مثالوں کا حوالہ دیا ہے، یہ دین کی اس حکمت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز ہی سے تمام نیکیاں نشو ونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آسکتیں، اور اگر نماز ہدم کر دی جائے تو دین واخلاق کا سارا چمن تاراج ہو کر رہ جائے گا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ جس نے نماز ضائع کر دی تو وہ باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر دے گا۔ (تدبر قرآن، ج ۵ ص: ۳۰۰)

واقعہ یہی ہے کہ نماز ہر برائی سے مانع ہے، اور نیکیوں کے پنپنے کا باعث ہے، فرمایا گیا ہے:

إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ (العنکبوت: ۴۵)

(ترجمہ: بیشک نماز بے حیائیوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

سورۂ معارج میں جہاں انسان کی کمزوری اور اس کے عیوب کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہاں جن لوگوں کو مستثنیٰ (الگ) کیا گیا ان میں وہی اہل ایمان ہیں جن میں مذکورہ بالا صفات ہیں، لیکن وہاں بھی استثنائی خصوصیات کے بیان میں اولیت نماز کو دی گئی ہے، اور وہاں بھی تکرار کے ساتھ اس کو اول وآخر میں بیان کیا گیا ہے اور پھر جنت میں اکرام وحترام کی بشارت دی گئی ہے۔

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً (۱۹) إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً (۲۰) وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعاً (۲۱)

إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ (۲۲)الَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (۲۳) وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ (۲۴) لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۲۵)وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُونَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ (۲۶) وَالَّذِيْنَ هُم مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِم مُّشْفِقُونَ(۲۷)إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ(۲۸)وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ(۲۹)إِلَّا عَلَى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِيْنَ (۳۰) فَمَنِ ابْتَغَى وَرَاء ذَلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْعَادُونَ (۳۱) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ(۳۲) وَالَّذِيْنَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ(۳۳)وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ(۳۴)أُوْلَئِكَ فِيْ جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ (۳۵) (المعارج)

(ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ انسان تھڑدلا پیدا ہوا ہے، جب اسے تکلیف لاحق ہوتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے، اور جب اسے مال ملتا ہے تو ہاتھ روک لیتا ہے، سوائے نمازیوں کے، جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، اور جن کے مال میں ایک طے شدہ حق سائل اور نادار کا ہے (جسے وہ ادا کرتے ہیں) اور جو روز جزا کی تصدیق کرتے ہیں، اور اپنے رب کے عذاب سے ڈرے سہمے رہتے ہیں۔ بیشک ان کے رب کا عذاب ڈرنے کے لائق ہے (اس سے بے خوف نہیں ہونا چاہئے) اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اس حکم سے ان کی بیویاں اور باندیاں مستثنی ہیں، ان کے معاملہ میں وہ قابل ملامت نہیں ہیں لیکن جو ان حدوں سے آگے بڑھیں گے، وہ زیادتی کرنے والے ہوں گے، اور جو اپنی امانتوں، وعدوں اور معاہدوں کا لحاظ کرتے ہیں، اور اپنی گواہی صحیح طور پر دیتے ہیں، اور اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے اور ان کا اہتمام کرتے ہیں، وہ جنت میں اعزاز واکرام سے نوازے جائیں گے۔

واقعہ یہی ہے کہ نماز کی بدولت ہی سارے اوصاف پیدا ہوتے ہیں اور ترک نماز سے انسان دینداری سے دور ہوجاتا ہے، آپ نے دیکھ لیا کہ کامل مومن کی کامیابی کی علامتوں میں ابتدا بھی نماز سے ہوئی اور اختتام بھی نماز پر، یہ وہ علامتیں ہیں جن کا حصول کمال ایمان کی دلیل ہے اور جس پر جنت کی بشارت ہے، اس میں تمام حقوق اللہ وحقوق العباد کی ادائیگی کو انتہائی اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان کردیا گیا ہے، گویا یہ پورا مضمون قرآنی اگر اپنے اندر اتار لیا جائے تو انسان مزکیٰ (پاک صاف) ہوجاتا ہے، اور پھر وہ جنت کی وراثت کا مستحق بن جاتا ہے۔

جنت کی وراثت

ان اوصاف سے مزین مومنوں کو بشارت دیتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿ أُوْلَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ . الَّذِيْنَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خَالِدُونَ ﴾ یہی وہ لوگ ہیں جو جنت کے وارث ہوں گے، ابتدا میں فلاح کا تذکرہ اور پھر علامات واوصاف کا بیان اور نتیجہ میں جنت کی وراثت کا اعلان اس پر دلیل ہے کہ فلاح حقیقی جنت میں داخلہ سے عبارت ہے، فلاح کا یہی تصور حقیقی اور درست تصور ہے، یہاں جنت ملنے کا تذکرہ بھی قرآن نے عجب انداز میں کیا ہے، ''أُوْلَئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ'' مذکورہ بالا اوصاف وخصوصیات سے متصف اور بالخصوص پابندی نماز اور نماز کی روح ''خشوع'' کے حاملین جنت کے وارث ہیں، جس طرح وراثت میں ارادہ و اختیار کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وراثت قانونی اور جبری طور پر وارث کو ملتی ہی ہے، اسی طرح جن لوگوں نے ان خصوصیات کے ذریعہ اپنا تزکیہ کیا ہوگا، اپنے ظاہر وباطن کو پاک کیا ہوگا، ان کا جنت میں داخلہ یقینی ہے۔

☆☆☆

❑ بحث و تحقیق

سرسید احمد خاںؒ اور معاصر دینی مدارس سے ربط وتعاون

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

سرسید علیہ الرحمہ (۱۷/ اکتوبر ۱۸۱۷ء۔ ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء) محض میدانِ تعلیم کے مردِ میداں نہیں تھے، بلکہ وہ ایک عظیم مصلح تھے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں سدھار لانے کی کوشش کی۔ وہ بڑے اعلیٰ ظرف اور وسیع النظر تھے۔ معاشرہ کے مختلف طبقے کے لوگوں سے ان کے روابط تھے اور روز مرّہ زندگی میں گوناگوں مصروفیات رکھنے والوں سے ان کے تعلقات استوار تھے۔ موافق و مخالف سب سے مکالمت و مفاہمت کا دروازہ انہوں نے ہمیشہ کھلا رکھا۔ اسی طرح ملک وملت کی فلاح و بہبود کے لئے تگ ودو کرنے والی انجمنوں وتنظیموں سے ربط وتعاون ان کا شیوہ تھا۔ بلا شبہ وہ جدید تعلیم کے علم بردار تھے اور اس راہ میں وہ تاحیات سرگرداں رہے، لیکن ملّی فلاح و بہبود کے کاموں میں ان کی گہری دلچسپی اور وسیع النظری کہ دینی داروں اور مدارس سے بھی روابط قائم رکھے اور ان کی اصلاح وترقی کے لئے فراخ دلانہ تعاون دیتے رہے۔ حقیقت یہ کہ ان کا تصورِ تعلیم بہت سے وسیع و بلند تھا۔ جدید تعلیم کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی وسرگرمی کے ساتھ وہ قدیم تعلیم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرتے تھے اور دینی مدارس کی اہمیت وافادیت بھی تسلیم کرتے تھے، یہ اور بات ہے کہ وقت کے تقاضوں کے تحت ان اداروں کے نظام ونصاب میں اصلاح وتبدیلی پر زور دیتے تھے، جیسا کہ ان کی نگارشات سے اس کے وافر ثبوت ملتے ہیں۔ دوسرے یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ سرسید جس وسیع پیمانے پر مختلف ذرائع سے تعلیم کی اشاعت چاہتے تھے، اس کا تقاضا تھا کہ اس سلسلہ میں مختلف حلقوں یا اداروں سے جو کوششیں ہو رہی ہیں ان سب میں آپس میں تال میل پیدا ہو اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی فضا پروان چڑھے۔ سرسید نے اس ضرورت کو نہ صرف محسوس کیا، بلکہ اس سمت میں عملی قدم بھی اٹھائے۔ معاصر علماء سے روابط اور اہلِ مدارس سے ربط وتعاون اسی کا ایک حصہ تھا۔ اس راہ میں انہوں نے جس اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا وہ ذیل کی تفصیلات سے بخوبی واضح ہوگا۔

سرسید کے معاصر مدارس میں سب سے قدیم ومشہور دارالعلوم دیوبند تھا جو ۱۸۶۶ء میں وجود میں آیا۔ اس مدرسہ اور ادارۂ سرسید (مدرسۃ العلوم/ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ) دونوں کے منتظمین واساتذہ کے مابین روابط کے بہت سے شواہد مآخذ میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے جو حقائق سامنے آتے ہیں، سب سے پہلے ان کا اجمالی جائزہ اس

مضمون میں مقصود ہے ۔۲۴؍مئی ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد جب مختلف مضامین کی تدریس کے لئے اساتذہ کی تقرری عمل میں آئی تو اولین عربی استاد اور منیجر بورڈنگ ہاؤس کی حیثیت سے ساکنِ کاندھلہ مولوی محمد اکبرؒ (م ۸؍جولائی ۱۸۸۶ء) کی تقرری ہوئی جو دیوبند کے حلقہ سے تعلق رکھتے تھے[۲]۔ یہ بات بخوبی معروف ہے کہ ایم۔اے۔او کالج میں دینیات کی تعلیم شروع ہی سے داخلِ نصاب رہی ہے۔اس کی درسیات کی تعیین اور تدریس کے نظم کے لئے سر سید نے خاص طور سے علماءِ دیوبند سے رابطہ قایم کیا۔اسی طرح شعبۂ دینیات کی سربراہی اور کالج کے طلبہ کی مذہبی و اخلاقی زندگی کی نگرانی کے لئے ناظمِ دینیات کی تقرری کا مسئلہ درپیش ہوا تو اس سلسلہ میں سرسید نے سب سے پہلے بانی مدرسہ دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے قریبی رفقاء مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور اور مولانا عبدالرشید گنگوہیؒ سے مراسلت کی اور آخر میں ۱۸۹۳ء میں اولین ناظمِ دینیات کی حیثیت سے دیوبند ہی حلقہ کے مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھویؒ کی تقرری عمل میں آئی جو مولانا مملوک علیؒ کے نواسے اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے[۳]۔ حقیقت یہ کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید میں فکری اختلافات کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے تئیں ادب واحترام اور قدر ردانی کے جذبات سے معمور تھے، جیسا کہ ان دونوں کے مابین مراسلات کے مجموعہ ''تصفیۃ العقاید'' (شائع شدہ از مطبع منشی محمد حیات، میرٹھ، ۱۲۹۸ھ) کے مشتملات شاہد ہیں ۔ کتاب کی ابتداء میں منقول مولانا محمد نانوتوی کے نام سرسید کے مکتوب کی عبارت ملاحظہ ہو:

''بعد سلام مسنون کے عرض ہے کہ بزرگانِ سہارنپور نے جو نوازش و دلسوزی میرے حالِ زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا میں دل سے ان کا شکر ادا کرتا ہوں۔اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں میری سعادت ہے، میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھتا ہوں''[۴]۔

مزید براں بانیِ مدرسہ دیوبند کی وفات پر سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان پر جو تعزیتی تحریر شائع کی تھی وہ بھی ان کے تئیں عقیدت واحترام کے جذبات سے معمور ہے۔ اس تحریر کے آخر میں مولانا مرحوم کے بارے میں سرسید نے یہ تاثر ظاہر کیا: ''خود بھی پابندِ شریعت تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی پابندِ سنت و شریعت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے۔بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا ان کو خیال تھا۔انہی کی کوشش سے علومِ دینیہ کی تعلیم کے لئے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور ایک نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی''۔مزید اہم بات یہ کہ اس تحریر کے خاتمہ پر سرسید نے لوگوں سے یہ اپیل کہ وہ اس مدرسہ کی بقا وتحفظ کے لئے کوشش کرتے رہیں، اس سے لوگوں کے دلوں پر ان کی اس عظیم یادگار کا نقش بھی ثبت رہے گا[۵]۔

اسی ضمن میں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ان حالات میں جب کہ سرسید کے بعض مذہبی افکار علماء کے حلقہ میں بحث و نقد کا موضوع بنے ہوئے تھے، مدرسہ دیوبند کی سالانہ رپورٹ (بابت سال ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) انہیں تبصرہ کے لئے بھیجی گئی۔ تہذیب الاخلاق کے یکم جمادی الثانی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء کے شمارہ میں اس روداد پر مفصل تبصرہ شائع کیا جو دس صفحات پر مشتمل تھا۔یہ تبصرہ تنقیدی تھا، لیکن اصلاح کے جذبہ سے لکھا گیا تھا۔اس تبصرہ میں مدرسہ کی مالی حالت کی خرابی، نصابِ تعلیم کے نقائص، اس میں اصلاح وترمیم کی ضرورت، اس کی مالی امداد کی جانب سے مسلمانوں کی بے توجہی اور معاش کے نقطۂ نظر سے فارغینِ مدرسہ کی بدحالی پر اپنے تاثرات ظاہر کرنے کے ساتھ سرسید نے مدرسہ سے دلی ہمدردی اور اس کی اصلاح وترقی کی خواہش کا اظہار بھی کیا ہے۔اس تبصرہ میں

مدرسہ کے نصابِ تعلیم پر انہوں نے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں، ان کا ماحصل یہ ہے: مدرسہ میں عصری علوم وجدید زبانوں کے پڑھانے کا اہتمام نہیں ہے۔اس کمی کی وجہ سے طلبہ میں یہ صلاحیت نہیں پیدا ہو پاتی کہ وہ موجودہ دور میں موثر انداز میں اسلام کی ترجمانی کرسکیں، یا مذہب کے بارے میں جدید ذہن کے شکوک وشبہات کو دور کر کے دین کا دفاع کرسکیں۔دوسرے یہ کہ مدرسہ کے طلبہ کو کوئی ایسا ہنر یا فن نہیں سکھایا جاتا جو وہاں سے فراغت کے بعد ان کے لئے معاش کے مسئلہ کو بہتر طور پر حل کرنے میں ممد ومعاون ثابت ہوسکے[۶]۔اسی طرح یہ بخوبی معروف ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نصابِ تعلیم کافی حد تک درسیات کے مشہور سلسلہ درسِ نظامی پر مبنی ہے اور علماءِ دیوبند کے زیرِ اثر یہی نصاب ہندوستان کے مدارس وانفرادی تدریسی مراکز میں زیادہ تر رائج رہا ہے۔سرسید کی مختلف تحریروں میں درسِ نظامی پر تبصرہ ملتا ہے جس میں انہوں نے جدید دور کے تقاضوں کے مطابق اس نظامِ تعلیم کی درسیات میں ترمیم و اصلاح پر زور دیا ہے۔انہوں نے درس نظامی سے متعلق اپنے ایک خصوصی مضمون میں اس کے تحت پڑھائے جانے والے تمام مضامین اور ان کی مقررہ کتب کی تفصیلات پیش کر کے اہلِ علم سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ اسے ملاحظہ کر کے خود فیصلہ کریں کہ موجودہ حالات میں یہ نصاب بعینہٖ مفید ہے یا اس میں کچھ تبدیلی کی ضرورت ہے[۷]۔مزید براں مدارس سے سرسید کی ہمدردی اس سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ مدرسہ دیوبند کی مذکورہ بالا سالانہ رپورٹ کو دیکھ کر انہوں نے اس پر سخت تعجب ظاہر کیا کہ یہ مدرسہ جہاں دینی علوم کے علاوہ اور کچھ نہیں پڑھایا جاتا اور'' جس میں مولوی محمد قاسم صاحب سا فرشتہ سیرت شخص نگراں ہے اور مولوی محمد یعقوب صاحب سا شخص مُدرّس ہے'' مالی خرابی وکمزوری کا شکار ہے۔یہ مسلمانوں کی بے حسی، بے توجہی وغفلت کی وجہ سے ہے[۸]۔

مدرسہ کی مالی حالی کی خرابی پر افسوس وتعجب کے اظہار کے ساتھ محسنِ قوم وملت نے اہلِ قوم سے یہ اپیل بھی کی کہ وہ اسے مالی تعاون دینے میں فراخ دلی سے کام لیں۔یہ اپیل خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''ہماری غرض اس تمام تحریر سے مسلمانوں کو اس بات کی غیرت دلانا ہے کہ ان کے دونوں کام دین ودنیا کے سب خراب وابتر ہیں، ان کو شرم آنی چاہئے کہ ان کے مدرسہ اسلامی دیوبند کا کیا حال ہے۔سب کو چاہئے کہ اس مدرسہ کی ایسی مدد کریں اور ایسی اعلیٰ ترقی پر پہنچائیں کہ جو اسلام کی رونق وشان کا نمونہ ہو''[۹]۔

واقعہ یہ کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب لاخلاق میں مدرسہ دیوبند سے متعلق صرف سرسید ہی کے مضامین وتبصرے نہیں شائع ہوتے تھے، بلکہ ان کے مدیر محترم ان میں دوسروں کی تحریروں کے بھی بخوشی شریکِ شاعت کرتے تھے۔اس ضمن میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مولوی شوکت حسین (حیدرآباد) کے مضمون کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جسے انہوں نے ستمبر ۱۸۹۷ء میں خاص طور سے مدرسہ میں دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے مالی اپیل کے طور پر لکھا تھا۔اس کا آخری حصہ ملاحظہ ہو:

''الحاصل زمانۂ دراز سے باوجود ایک غیر مستقل اور جزوی آمدنی کے یہ مدرسہ (دیوبند) ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ ترقی یافتہ حالت ہی کے ساتھ قایم چلا آتا ہے اور یہ بے شک کسی مقبول دعاء ہی کا اثر ہے کہ اب تک ایک مختصر مکان بھی مدرسہ نے بطور خود تعمیر کرلیا ہے۔کچھ کتب خانہ بھی ہوگیا ہے، جہاں تک ہوسکتا ہے طلبہ کو بھی بھوکوں مرنے نہیں دیتا اور جیسے کچھ بھی ہوں ہر سال حافظ، مولوی اور عالم بھی بناتا ہی رہتا ہے۔غرض کہ ہندوستان میں اس وقت یہی ایک مدرسہ ہے جو تمام مدارس کے مقابل ہر

ایک پہلو سے ممتاز اور ہماری کوششوں اور تائید سے مستفیض ہونے اور فائدہ پہنچانے کی قابلیت رکھنے والا نظر آتا ہے''[۱۰]۔

اس دور کا دوسرا دینی تعلیمی ادارہ ندوۃ العلماء تھا۔اس سے زمانۂ قیام ہی سے سرسید کے روابط کے شواہد ملتے ہیں۔ دینی تعلیم کے ایک مرکز کی حیثیت سے ندوۃ العلماء ۱۸۹۸ء میں لکھنو میں وجود میں آیا، لیکن مجلس ندوۃ العلماء (جس کی تشکیل ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام، کانپور کے سالانہ جلسہ کے موقع پر ہوئی تھی) کی سرگرمیاں اس سے کئی سال قبل کانپور سے جاری ہوچکی تھیں۔اس ضمن میں اس کا اولین جلسہ (جو ۲۲۔۲۴ اپریل ۱۸۹۴ء کو مدرسہ فیض عام کانپور میں منعقد ہوا تھا) بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اہم بات یہ کہ مہتمم جلسہ مولانا محمد علی مونگیریؒ کی جانب سے اس کا دعوت نامہ جدید تعلیم کے علم بردار اور اس کی اشاعت میں پوری طرح سرگرداں رہنے والے سرسید علیہ الرحمۃ کو بھی بھیجا گیا تھا۔تاریخ ندوۃ العلماء کے مولفِ گرامی اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور اس تحریک کے داعیوں کو قریب کرنے کے لئے ندوۃ العلماء کے بانیوں نے اس طبقہ کے با اثر حضرات سے رابطہ پیدا کیا اور انہیں اس اجلاس کی دعوت دی۔مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء نے اس سلسلہ میں سرسید احمد خاں کو جو خط لکھا تھا اس کا مفصل جواب سرسید نے دیا اور ندوۃ العلماء کے مقاصد سے دلچسپی کا اظہار فرمایا، نیز انہوں نے وہ تجاویز پیش کیں جو خود ندوۃ العلماء کے داعیوں کے پیشِ نظر تھیں''[۱۱]۔

جلسہ کے انعقاد کی اطلاع ملنے کے بعد سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ''عظیم الشان علمی جلسہ'' کے عنوان سے مہتمم مدرسہ فیض عام (جناب الٰہی بخش) کی طرف سے اس جلسہ کے انعقاد کی تفصیلی خبر بھی شائع کی تھی[۱۲]۔

سرسید خود تو اس میں شریک نہ ہوسکے، لیکن اس موقع پر پیش کرنے کیلئے انہوں نے ایک تفصیلی پیغام ناظمِ جلسہ کے نام خط کی صورت میں ارسال کیا تھا۔ایم-اے-او کالج کے اساتذۂ کرام میں پروفیسر عربی و فارسی مولانا شبلی نعمانیؒ اور ناظمِ دینیات مولانا عبداللہ انصاریؒ جلسہ میں شریک ہوئے تھے اور اس کے اجلاسوں کی کاروائی میں سرگرمی سے حصہ لیا۔جلسہ کے روحِ رواں علی گڑھ کے ممتاز عالم مولانا لطف اللہ (استاد مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی) تھے جنہیں دو (اول وسوم) اجلاسوں کی صدارت کا شرف حاصل ہوا۔پہلے اجلاس میں مولانا عبداللہ انصاری اور دوسرے میں مولانا شبلی نے تحریکِ صدارت پیش کی تھی۔پہلا اجلاس طلبہ میں اسناد کی تقسیم کے لئے وقف رہا، بقیہ اجلاسوں میں ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد، دینی تعلیم کے نظام کی اصلاح وترقی، نصاب میں ترمیم واصلاح اور مجوزہ نئے تعلیمی ادارہ سے متعلق تقریریں ہوئیں، تجاویز پیش کی گئیں اور ان پر بحث ومباحثہ ہوا[۱۳]۔

اس موقع پر سرسید نے اپنا جو پیغام ناظم جلسہ کے نام خط کی صورت میں بھیجا تھا وہ بقول سرسید ''کسی مصلحت سے علمائے کرام کے سامنے پیش نہیں ہوسکا''[۱۴]۔لیکن یہ مختلف اعتبار سے بڑی اہمیت ومعنویت کا حامل ہے۔اس اہم خط کا مکمل متن (تین صفحات پر مشتمل) تاریخ ندوۃ العلماء (حصہ اول) میں بھی انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے۔جلسہ کے مقاصد (علوم اسلامیہ کے احیاء وتحفظ اور علماء کے باہمی اختلافات کے ازالہ کی تدابیر پر غور وفکر) کو ''نہایت عمدہ ومفید'' قرار دیتے ہوئے سرسید نے یہ دعاء بھی کی تھی:

''خدا تعالیٰ ان میں کامیاب کرے اور خدا تعالیٰ ہمارے زمانے کے علماء کو سلفِ صالح کی پیروی نصیب کرے اور اختلافی مسائل میں ایک دوسرے کی عداوت ان کے دل سے دور کرے''۔اس خط کے توسط سے سرسید نے علماء کو جو پیغام دینا چاہا تھا اس کا لبِّ

لباب یہ تھا کہ جدید علوم وفنون بالخصوص جدید فلسفہ وسائنس کی تعلیم سے طلبہ کے عقاید میں جو خلل وفساد واقع ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے وہ اس علمِ کلام سے دور نہیں ہوسکتا جسے عباسی خلافت کے زمانے میں مسلم متکلمین نے یونانی فلسفہ کے نقصانات کے ازالے کے لئے ایجاد کیا تھا اور نہ ہی قدیم علمِ کام کی تعلیم سے ان اعتراضات کے رفع کرنے کی صلاحیت پیدا ہوسکتی ہے جو جدید فلسفہ وسائنس کی روشنی میں اسلامی عقاید وتعلیمات پر وارد جاتے ہیں۔ کیا اس صورتِ حال میں جدید علم کلام کے ایجاد اور اسی کے مطابق درسیات تیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟۔ یہ نکات خود سرسید کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

''مگر ایک اور امر جو سب سے ضروری اور مقدم ہے، میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زمانہ مسلمانوں پر ایسا گذرا ہے جس میں بجز تحصیل علومِ دین کے اور کسی علم سے سروکار نہ تھا، جس کے سبب علومِ دین کی ہزاروں کتابیں حدیث، تفسیر، فقہ، اسماءِ رجال، اصول حدیث، اصولِ فقہ وغیرہ موجود ہوگئیں۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا جس میں حکمت وفلسفہ یونان کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور اس کے سبب عقایدِ مذہبی میں بہت کچھ خلل واقع ہوا یا واقع ہونے کا اندیشہ ہوا۔ اس وقت علماء نے مذہبِ اسلام کی تائید پر کمر باندھی اور علم کلام ایجاد کیا اور اسلام کی نصرت کی۔ مگر اب وہ زمانہ بھی گیا اور جدید فلسفہ اور جدید حکمت اور جدید علومِ حکمیہ پیدا ہوگئے اور اس کے مسائل اور جو جدید تحقیقاتِ علومِ طبعی کی اس میں ہوئی ہے وہ بہت زیادہ مخالفِ مسائلِ موجودہ اسلام کی ہے۔ اور ان جدید علوم کا شیوع ہوتا جاتا ہے اور کسی کے بند کرنے سے بند نہیں ہوسکتا۔ اگلے زمانہ کے عالموں نے بھی حکمت اور فلسفہ یونان، بلکہ منطق کے پڑھنے کو بھی حرام قرار دیا تھا، مگر اس سے کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ ہزاروں لاکھوں آدمیوں نے اس کو پڑھا اور لاچار خود علماء نے اس کی تحصیل کی اور علمِ کلام ایجاد کیا۔ (اب) جو مسائلِ حکمت وفلسفہ وطبیعات کے علومِ جدیدہ کے ذریعہ سے پیدا ہوئے ہیں، ان کے لئے وہ علمِ کلام جو یونانی فلسفہ وحکمت کے مقابل بنایا گیا تھا کافی نہیں ہے اور تفاسیرِ قرآن مجید و حدیث شریف اور دیگر کتبِ مصنفہ اہلِ اسلام میں اس کے متعلق کچھ پایا نہیں جاتا اور اس سبب سے الحاد وزندقہ مسلمانوں میں پھیلتا جاتا ہے جو نہایت سخت وبا ہے جس کی روز بروز ترقی ہونے کی امید قوی ہے۔ پس اس کا کیا علاج ہے''[۱۵]۔

حقیقت یہ کہ سرسید مسلمانوں میں جدید فلسفہ وسائنس کی ترویج کی ابتداء سے ہی علماء کو اس جانب متوجہ کرتے رہے اور جدید فلسفہ وسائنس کے حوالے سے مذہب ومذہبی عقائد کے بارے میں ابھرنے والے شکوک وشبہات کے ازالہ کی خاطر وہ علماء میں نئے علمِ کلام کی ایجاد وترقی کی تحریک پیدا کرتے رہے، لیکن اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہونے پر انہیں افسوس رہا۔ دسمبر ۱۸۹۴ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس (منعقدہ علی گڑھ) سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا:

''میں نے ابتداء سے یعنی جب سے کہ زبانِ انگریزی اور علومِ جدیدہ کے مسلمانوں میں رائج ہونے کی کوشش کی، اس بات کی خواہش کی ہے کہ ہمارے زمانے کے علماء اس مشکل امر پر متوجہ ہوں اور علومِ جدیدہ کے مقابلہ میں علمِ کلام پیدا کریں، مگر افسوس کہ کسی نے اس پر توجہ نہیں کی ہے''[۱۶]۔

بہر حال مجلسِ ندوۃ العلماء کے اولین جلسہ کے انعقاد کے بعد منتظمین نے اس کی روداد (حصہ اول) سرسید کو ارسال کی تو (اس کے باوجود کہ ان کا پیغام جلسہ میں پڑھ کر نہیں سنایا گیا تھا) اس کے جواب میں اظہارِ تشکر کرتے ہوئے یہ بھی تحریر کیا:

''ایک عمدہ کام شروع ہوا ہے، اس کو چلنے دینا چاہئے۔ خدا اس کا

نیک نتیجہ پیدا کرے۔ میں اس کی رسید اخبار میں چھاپوں گا اور نواب محسن الملک مولوی سید علی مہدی کانفرنس کے اجلاس میں ایک رزولیوشن پیش کریں گے''۱۷۔ اس کے واضح شواہد موجود ہیں کہ سرسید نے دونوں وعدے پورے کر دکھائے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں روداد جلسہ کی وصول یابی کی خبر شکریہ کے ساتھ شائع کی ۱۸۔ اور کانفرنس کے کے اجلاس (منعقدہ بتاریخ ۲۷۔۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء بمقام علی گڑھ) میں تحریک ندوۃ العلماء کی تائید میں سرسید کے رفیقِ خاص نواب محسن الملک نے رزولوشن پیش کیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔ رزولیوشن کے الفاظ یہ تھے:

''اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء جو مقام کانپور منعقد ہوا تھا اور جس میں علماء واکابرِ دین جمع ہوئے تھے تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقۂ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی متصور ہے بدل و جان قلم سے، قدم سے، درم سے مدد کرنی چاہئے''۱۹۔

مزید برآں مذکورہ رزولوشن پیش کرتے ہوئے نواب صاحب نے جو تقریر کی اس کی کافی تحسین وتوصیف ہوئی۔ صدر اجلاس محمد شاہ دین اور دیگر ممبرانِ کانفرنس کی تجویز کے مطابق مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسے (مع دوسری تائیدی تقاریر) علیٰحدہ رسالہ کی صورت میں ۱۸۹۵ء میں طبع کرا کے تقسیم کا اہتمام کیا تھا۲۰۔

اسی سلسلہ میں یہ اضافہ بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مذکورہ تاریخی جلسہ سے تقریباً دو ماہ قبل تحریکِ ندوۃ العلماء کے ایک اہم رکن مولانا حکیم سید عبدالحئی (جو ناظمِ جلسہ کے دستِ راست تھے اور بعد میں ایک طویل عرصہ تک ندوۃ العلماء کے ناظم بھی رہے) نے سرسید کو پند ونصائح پر مشتمل ایک خط ارسال کیا تھا جس میں انہیں خاص طور سے سلفِ صالحین کے طریقہ پر چلنے کی نصیحت کی تھی۔ اس کے جواب میں سرسید نے جو کچھ تحریر فرمایا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ خود انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

مولانا حکیم جناب مولانا و مخدومنا مولوی سید عبدالحئی صاحب، ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ'' آپ کا نوازش نامہ مملو از نصائح ارجمند پہنچا۔ میں آپ کی عنایت و ہمدردیِ اسلامی کا نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میری دعاء اپنے لئے اور آپ کے لئے اور سب مسلمانوں کے لئے خدائے کریم سے یہی ہے کہ '' اھدنا الصراط المستقیم صراط الّذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم و لا الضالّین'' ۲۱۔

آخر میں یہ وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مدارس سے سرسید کے روابط مضبوط کرنے میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (جو پہلے سین ٹیفک سوسائٹی اخبار کے نام سے موسوم تھا) کا اجراء مارچ ۱۸۶۶ء میں عمل میں آیا۔ اس دولسانی اخبار میں مدارس و دینی اداروں سے متعلق خبروں، ان کی سالانہ رودادوں پر تبصرے، اہلِ مدارس کی وفات پر تعزیتی تحریروں اور مذہبی تعلیم و مدارس کے نظامِ تعلیم اور اس کی اصلاح و ترقی سے متعلق مضامین کی اشاعت مستقل ہوتی رہتی تھی۔ یہاں یہ ذکر بھی اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ سرسید اور ایم۔ اے۔ او کالج سے متعلق اہل مدارس کے کچھ ذہنی تحفظات کے باوجود معروف مدارس کے ارباب انتظام اپنے مدرسوں کی سالانہ روداد یا کارکردگی کی تفصیلات اور ان میں منعقد ہونے والے پروگراموں کی رپورٹیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے مدیرِ محترم سرسید کو ارسال کرتے تھے اور وہ انہیں بخوشی شائع کرتے تھے۔ مزید براں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں وفات پانے والی شخصیات پر سرسید کی جو تعزیتی تحریریں شائع

ہوئی ہیں ان میں سے متعدد دینی تعلیم کے ماہرین یا مدارس میں تدریس وانتظام سے وابستہ علماء سے تعلق رکھتی ہیں، جیسا کہ پروفیسر اصغر عباس کی مرتبہ کتاب ''سرسید کی تعزیتی تحریریں'' (جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مضامین پر مبنی ہے) سے واضح ہوتا ہے[۲۲]۔ اسی ضمن میں یہ ذکر بھی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے آثار قدیمہ سے متعلق سرسید کی مشہور تحقیقی تصنیف ''آثار الصنادید'' کا ایک حصہ مختلف علوم وفنون کے میدان میں ممتاز شخصیات کے احوال وکوائف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں ''علماءِ دین'' کی سرخی کے تحت ۲۹ علماء کرام کا تذکرہ ہے۔ اہم بات یہ کہ ان میں بعض ان علماء کا ذکر خیر بھی شامل ہیں جو سرسید کے ناقدین میں سے تھے[۲۳]۔

یہ بات بخوبی معروف ہے کہ مسلمانوں میں قدیم وجدید تعلیم کی اشاعت اور ان کے تعلیمی اداروں کی توسیع وترقی کے لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (جس کے سرسید احمد خاں بانی سکریٹری رہے ہیں) کی خدمات بہت ہی مفید اور قابلِ قدر رہی ہیں۔ ان خدمات کا ایک وقیع حصہ دینی تعلیم کے فروغ اور مدارس کے نظام کی مضبوطی وبہتری اور جدید تعلیم کے اسکولوں وکالجوں میں مسلم طلبہ کے لئے مذہبی تعلیم کے اہتمام سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ اس کی تفصیلات سالانہ اجلاسوں کی رودادوں، انوار احمد مارہروی کی مرتبہ ''مرقع کانفرنس''[۲۴] اور پروفیسر اختر الواسع کی کتاب (سرسید کی تعلیمی تحریک۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ) میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں[۲۵]۔

مختصر یہ کہ معاصر دینی مدارس سے سرسید کے ربط وتعاون کا یہ ایک مختصر جائزہ ہے جو خاص طور سے دیوبند ولکھنو کے معروف دینی اداروں کے حوالے سے پیش کیا گیا۔ اگر معاصر مآخذ (بالخصوص علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ وتہذیب الاخلاق کی قدیم فائلوں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی رودادوں اور سرسید کے خطوط وخطبات کے مجموعوں) کی چھان بین کی جائے تو اس سے متعلق مزید مواد فراہم ہوسکتا ہے اور مذکورہ مدارس کے علاوہ دوسرے مدارس (بالخصوص پنجاب کے مدارس) سے بھی سرسید کے ربط وتعاون کے شواہد مل سکتے ہیں۔ اللہ کرے ادارۂ سرسید کے فرزندوں میں سے کسی کو اس موضوع پر مزید مطالعہ وتحقیق کی توفیق نصیب ہو۔

خلاصہ یہ کہ زیرِ بحث موضوع پر جو کچھ تفصیلات اوپر پیش کی گئیں ان سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سرسید کی تعلیمی تحریک کا دائرہ بہت وسیع تھا، وہ جدید تعلیم کے دلدادہ تھے اور اسی کے ساتھ دینی تعلیم کے قدرداں بھی تھے۔ انہوں نے دینی تعلیم کی اشاعت میں مصروف رہنے والے اور مدارس کے نظم ونسق سے منسلک علماء سے ربط قایم رکھنے اور اسے مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مزید یہ کہ انہوں نے دینی تعلیم کے مراکز کی اصلاح وترقی کے کاموں میں گہری دلچسپی لی اور اس راہ میں سرگرداں رہنے والوں کو فراخ دلانہ تعاون دیا۔ مزید اہم بات یہ کہ وہ ملت کے رہنماؤں یا علماء کے مابین اتحاد واتفاق کے متمنی رہے اور اس کے لئے دعائیں بھی کرتے رہے۔ اللہ رب العزت ان کی دینی وملّی خدمات کو قبول فرمائے اور ہمیں ان سے سبق حاصل کرنے کی توفیق عنایت کرے۔ آمین ثم آمین۔

حواشی ومراجع

۱۔ تفصیلات کے لئے دیکھئے: ظفر الاسلام اصلاحی، مطالعاتِ سرسید (باب دوم۔ سرسید اور باہمی انجمنیں۔ باہمی ربط وتعاون)، ادارہ علومِ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص ۴۰۔۶۴

۲۔ اصغر عباس (مرتب)، سرسید کی تعزیتی تحریریں،

ایجوکیشنل بک ہاؤس،علی گڑھ،۱۹۸۹ء،ص ۲۳۔۲۴؛ ظفرالاسلام اصلاحی، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا قیام اور اس کے اولین نقوش، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۱۸ء،ص۸۲۔۸۳۔

۳۔ خطوط سر سید، مرتبہ سر راس مسعود، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۱ء، ص ۱۷۳۔۱۷۴؛ نور الحسن راشد کاندھلوی، مولانا عبداللہ انصاری انبیٹھوی، فکر و نظر، علی گڑھ (نامورانِ علی گڑھ۔خصوصی شمارہ/ دوسرا کارواں)، جلد۲۳، ۱۹۸۶ء،ص۴۰۶۔

۴۔ تصفیۃ العقاید، مطبع منشی محمد حیات، میرٹھ، ۱۲۹۸ھ، ص۳؛ مکتوبات سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۲۳۔

۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۴/ اپریل، ۱۸۸۰ء، ص۴۶۷۔۴۶۸ ؛ مقالاتِ سر سید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۲۰۵/۸۔۲۰۶۔

۶۔ مقالاتِ سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقیِ ا دب، لاہور، ۱۹۹۱ء ۲۸۴/۷۔۲۸۵۔

۷۔ مقالاتِ سرسید، ۱۰۹/۸۔۱۱۳۔

۸۔ مقالاتِ سرسید، ۲۷۸/۷۔۲۷۹۔

۹۔ مقالاتِ سرسید، ۲۸۷/۷۔

۱۰۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۸/ ستمبر ۱۸۹۷ء

۱۱۔ محمد اسحاق جلیس ندوی، تاریخ ندوۃ العلماء، دفتر نظامت، ندوۃ العلماء، لکھنو، ۱۹۸۳ء، ۱۱۳/۱

۱۲۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۳/ اپریل ۱۸۹۴ء، ص۳۳۶۔

۱۳۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص۳۲۲۔۳۲۸؛ تاریخ ندوۃ العلماء، ۹۵/۱۔۹۷، ۱۰۳۔۱۰۵۔

۱۴۔ مقالاتِ سرسید، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء، ۲۶۱/۱۲۔

۱۵۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۶/اپریل ۱۸۹۴ء، ص۳۵۸، مقالاتِ سرسید، مجلسِ ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ۲۵۹/۱۲۔۲۶۱؛ تاریخ ندوۃ العلماء، ۱۱۳/۱۔۱۱۵۔

۱۶۔ مقالاتِ سرسید، ۲۵۹/۱۲۔

۱۷۔ خطوطِ سرسید، محولہ بالا، ص۱۷۱۔

۱۸۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۲۵/ دسمبر ۱۸۹۴ء، ص ۱۲۵۸۔

۱۹۔ مجموعہ رزولیوشن ہائے دہ سالہ [۱۸۸۶ء۔ ۱۸۹۵ء] محمدن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس، مرتبہ سرسید احمد خاں، آگرہ، ۱۸۹۶ء، ص۵۸؛ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۴/جنوری ۱۸۹۵ء، ص۲۰۔

۲۰۔ رزولیوشن در باب تائید ندوۃ العلماء کانپور [معہ اوس کی متعلقہ اسپیچوں کے]، اجلاس نہم محمدن ایجوکیشنل کانفرنس مقام علی گڑھ، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۵ء، ص۲۔

۲۱۔ مکاتیب سرسید، ص۳۸۸۔

۲۲۔ اصغر عباس (مرتب)، سر سید کی تعزیتی تحریریں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء۔

۲۳۔ سرسید احمد خاں، آثار الصنادید (مرتبہ خلیق انجم)، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی۔۲۰۰۳ء، ۵۱/۲۔۱۱۲۔

۲۴۔ انوار احمد مارہروی، مرقع کانفرنس، علی گڑھ، ۱۹۳۵ء۔

۲۵۔ اختر الواسع، سر سید کی تعلیمی تحریک۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجمالی مطالعہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص۶۳۔۶۵، ۱۰۲۔۱۰۸۔

☆☆☆

❑ بحث و تحقیق

تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی اور معارف السنن شرح سنن الترمذی

ایک تقابلی جائزہ

حافظ انس بلال
ریسرچ فیلو شعبۂ دینیات سنّی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
aligarhanas2013@gmail.com

کتب ستہ میں ''صحیح بخاری'' کے بعد اگر کسی کتاب پر علماء ومحدّثین نے سب سے زیادہ توجہ واعتنا کیا تو وہ ''جامع ترمذی'' ہے۔اس کتاب کی اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کی متعدد شرحیں لکھیں گئیں، مختصرات ومستخرجات تیار کئے گئے اور اس پر متقدمین ومتاخرین علماء کے ذریعہ مفید اور قیمتی حواشی و تعلیقات لکھے گئے، جس کی تفصیل حاجی خلیفہ چلپی کی کشف الظنون عن أسامی الکتب والفنون، عمر رضا کحّالہ کی معجم المؤلفین، الیان سرکیس کی معجم المطبوعات العربیۃ والمعربۃ اور فؤاد سزگین کی تاریخ التراث العربی وغیرہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

متقدمین علماء میں ترمذی کی سب سے مشہور شرح علامہ ابن عربی مالکیؒ متوفی ۵۴۳ھ کی ''عارضۃ الأحوذی فی شرح الترمذی'' ہے، علامہ سیوطیؒ متوفی ۹۱۱ھ نے بھی ''قوت المغتذی'' کے نام سے اس کی مفید شرح لکھی ہے، اس کے علاوہ ابن سید الناس شافعی متوفی ۷۳۴ھ اور سراج احمد سرھندی کی بھی شروح ترمذی ہیں۔ متاخرین علماء میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی ''العرف الشذی''، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی ''الکوکب الدری'' اور اشفاق الرحمٰن کاندھلویؒ کی ''الطیب الشذی'' مشہور ہیں۔لیکن متاخرین کی جن دو شرحوں کو خاص طور پر قبولیت وامتیازی مقام حاصل ہوا وہ ترمذی کی دوسری شرحوں کو حاصل نہیں ہوسکا، ان میں سے پہلی شرح ''تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی'' ہے، جس کے مصنف اہلِ حدیث کے بڑے عالم مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوریؒ ہیں، اور دوسری مسلک دیوبند کے ممتاز عالم دین مولانا یوسف بنوریؒ کی فاضلانہ شرح ''معارف السنن شرح سنن الترمذی'' ہے۔اس مقالہ میں ان دونوں شرحوں کا ایک مختصر تقابلی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۱) ''معارف السنن'' کوئی آزاد ومستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ''العرف الشذی'' کی تفصیل وتشریح ہے۔جس میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے ''جامع ترمذی'' پر امالی جمع کردیئے گئے ہیں۔علامہ یوسف بنوریؒ ان امالی کی تشریح وتفصیل کے پابند ہیں، چنانچہ اکثر وہ ان ہی مباحث سے کلام کرتے ہیں جو ان امالی میں پائے جاتے ہیں۔

''تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی'' ایک مستقل علیحدہ تصنیف ہے جس کے مصنف روایت کی تشریح

میں کبھی تفصیل سے کلام کرتے ہیں اور اگر تفصیل کا موقع نہیں ہوتا تو اختصار سے کام لیتے ہیں۔

(۲) ''معارف السنن'' مکمل نہیں ہے، علامہ بنوریؒ، کتاب الحج تک ہی شرح لکھ سکے تھے جس کے بعد اس کی تکمیل کا موقع نہیں مل سکا۔ جبکہ ''تحفۃ الأحوذی'' شروع سے آخر تک ایک مکمل شرح ہے، حتیٰ کہ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے ''سنن ترمذی'' کے آخر میں ''کتاب العلل'' کی بھی شرح لکھ دی ہے۔

(۳) علامہ بنوریؒ اور علامہ مبارکپوریؒ دونوں شارحین ترمذی نے اپنی شرح میں ایک مقدمہ تصنیف کیا ہے۔ جس میں حدیث اور فقہ کے مباحث سے بحث کی ہے اور امام ترمذی کی سوانح اور ان کی کتاب کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے علامہ بنوریؒ کا مقدمہ مفقود ہے۔ حالانکہ انہوں نے چھٹی جلد کے اخیر میں اس مقدمہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔(۱) جبکہ ''تحفۃ الاحوذی'' کا مقدمہ مکمل طور پر کتاب کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

(۴) علامہ یوسف بنوریؒ حنفی المسلک ہیں، لہٰذا انہوں نے اپنی شرح میں فقہ حنفی کی خدمت کا کام خاص طور پر انجام دیا ہے۔ جبکہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ اہل حدیث مسلک (۲) سے تعلق رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ''تحفۃ الأحوذی'' میں جابجا یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کا مسلک پیش کرنے کے بعد علامہ مبارکپوریؒ حدیث کے ظاہرِ الفاظ سے قریب تر معنی ومطلب کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۵) حدیث اور فقہ کے مشہور مصادر ومآخذ دونوں شارحین ترمذی کے درمیان مشترک ہیں، دونوں مصنفین قبول واخذ روایات میں اصل مصادر سے استفادہ کرتے ہیں۔ علامہ مبارکپوری قدیم مآخذ کے ساتھ ساتھ کچھ متاخر مآخذ وشروح پر بھی انحصار کرتے ہیں، مثال کے طور پر علامہ شوکانیؒ کی ''نیل الأوطار'' سے جابجا استفادہ کرتے ہیں۔

(۶) علامہ بنوریؒ نے اپنی شرح میں فقہی احکام کے مباحث پر زیادہ توجہ دی ہے۔ احادیث کی تخریج اور رواۃ کی جرح وتعدیل پر زیادہ کلام نہیں کیا ہے کیونکہ ان موضوعات پر مشہور کتابیں موجود ومتداول ہیں۔ لیکن علامہ مبارکپوریؒ روایت سے متعلق تمام حدیث وفقہ کے گوشوں کو زیر بحث لاتے ہیں۔

(۷) علامہ بنوریؒ نے اس حصہ سے بھی سرسری طور پر گذر گئے ہیں جہاں امام ترمذیؒ ''**وفي الباب عن فلان**'' کہہ کر اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اس موضوع پر ان کی مستقل کتاب ''**لبّ اللباب في تخريج مايقوله الترمذي وفي الباب**'' موجود ہے جس میں ان احادیث کی تخریج کر دی ہے۔(۳) لیکن علامہ مبارکپوریؒ نے اس حصہ پر خاص طور سے اپنی شرح میں کلام کیا ہے۔

(۸) علامہ بنوریؒ نے متنِ حدیث کی تشریح کا معروف اسلوب شرح قولی اپنایا ہے۔ جبکہ علامہ مبارکپوریؒ کا اسلوب شرح ممزوج کا ہے۔

(۹) دونوں شرحوں میں امّہات الکتب اور مآخذ سے منقول اقوال واقتباسات کی نسبت ان کے اصل مصنفین کی طرف جاتی ہے اور یہی علمی امانت کا تقاضا اور اخلاقی فریضہ ہے۔

(۱۰) دونوں کتابیں ہندوپاک اور بلادعرب میں مشہور ومتداول ہیں۔ لیکن ''تحفۃ الاحوذی'' کے حصہ میں عرب ممالک کے اندر زیادہ شہرت وعزت آئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ''تحفۃ الاحوذی'' کی اشاعت کا زمانہ ''معارف السنن'' سے پہلے کا ہے۔ چنانچہ اہل علم کے درمیان یہ کتاب مقبول ورائج ہوگئی اور اسے ترمذی کی شرحوں میں مرجع کی حیثیت حاصل ہوگئی۔(۴)

یہاں پر دونوں شرحوں کی خصوصیات کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

تحفۃ الاحوذی شرح جامع الترمذی: خصوصیات وامتیازات:

(۱) پوری کتاب میں شروع سے آخر تک ایک خاص قسم کا ربط وتسلسل نظر آتا ہے۔

الف۔ حدیث کے رواۃ کے تراجم اوران کے احوال وکوائف نیز عدالت وجراحت کے اعتبار سے ان پر تبصرہ کرنا۔

ب۔ احادیث کی تخریج ضرور کرتے ہیں چاہے وہ متن حدیث ہو یا وفي الباب عن فلان کے تحت ہو۔

ج۔ متن حدیث پر امام ترمذیؒ کے ذریعہ لگائے گئے حکم کا محاکمہ کرتے ہیں، ضرورت ہوتی ہے تو اس کی وضاحت واستدراک بھی کرتے ہیں۔ نیز ''وفي الباب عن فلان'' کے تحت احادیث پر درایت وروایت کے اعتبار سے کلام کرتے ہیں۔

د۔ نص حدیث کی تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔

ھ۔ فقہِ حدیث کو بیان کرتے ہیں اور فقہِ حدیث سے متعلق مذاھب اور آراء کا جائزہ لیتے ہیں پھر اس کے متعلق اپنی ذاتی رائے دیتے ہیں اور ظاہرِ نص حدیث کے۔ اقرب الرأی کو راجح قرار دیتے ہیں۔

(۲) حدیث کی تشریح کرتے ہوئے بہت آسان وسہل اسلوب اختیار کرتے ہیں، عام طلباء آسانی سے استفادہ کرسکیں۔

(۳) ''تحفۃ الاحوذی'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف باب کے موضوع سے ہٹ کر کلام نہیں کرتے ہیں اوران چیزوں سے بالکل بحث نہیں کرتے ہیں جن کا تعلق اس باب کے موضوع سے نہیں ہے۔

اس طرح قاری یہ محسوس کرے گا کہ مصنف، اختصار وجامعیت کے ساتھ ساتھ موضوع الباب سے متعلق ہر اہم چیز کی وضاحت کررہے ہیں اور غیر متعلق چیزوں پر کلام کو طول نہیں دے رہے ہیں۔

(۴) تحفۃ الاحوذی ایک آسان مبسوط شرح ہے جو سہل اسلوب میں لکھی گئی ہے، قاری کسی بھی طرح کے علمی اغماض اور پیچیدگی کو نہیں پائے گا جسے حل کرنے میں بہت زیادہ ذہنی جہد ومشقت کی ضرورت ہو۔ (۵)

معارف السنن: خصوصیات وامتیازات:

(۱) مصادر اصلیہ وماٰخذ سے اقتباسات لفظ بلفظ نقل نہ کرکے علامہ بنوریؒ عام طور پر اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کردیتے ہیں اور ایسا طوالت سے بچنے کیلئے کرتے ہیں۔ طویل متون واقتباسات کو آسان لفظوں اور سہل اسلوب میں تلخیص کرکے پیش کرنے کا فن علامہ بنوریؒ کا خاص امتیاز اور وصف ہے۔

(۲) بعض احادیث نبویہ کی تشریح میں ایسی اہم اور قیمتی توجیہات بیان کرتے ہیں جو سلف میں سے عام طور پر کسی نے نہیں کی ہیں۔ (۶)

(۳) حدیث اور فقہ سے متعلق مشکل مباحث کا احاطہ کرنا، خاص طور سے مختلف آراء ومسالک کو ان کے اصل ماٰخذ کے ذریعہ پیش کرنا علامہ بنوریؒ کا امتیازی منہج ہے۔

(۴) بعض موضوعات اور مسائل کی تحقیق وتشریح مختلف جہات (حدیث، فقہ وتاریخی) سے کرتے ہیں۔

(۵) ''معارف السنن'' کا سب سے اہم وصف وامتیاز مسلک حنفیہ کی خدمت، تحقیق وتخریج اور تشریح وتفہیم ہے۔ نیز دیگر فقہی مسالک ومکاتب میں اس کے امتیاز کو نمایاں کرکے پیش کرنا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ''معارف السنن'' فقہ حنفی پر اس کے متبعین کا بہت حد تک اعتماد بحال کرنے میں مدد کرتی ہے۔ کیونکہ ''فقہ حنفی'' پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اس مسلک میں حدیث وسنت کے مقابلے میں رائے اور قیاس کو زیادہ اہمیت وترجیح دی جاتی ہے۔

چنانچہ ''معارف السنن' کا بالاستیعاب مطالعہ مذہب حنفی کی بنیادوں اور دلائل نقلیہ وعقلیہ کو سمجھنے میں کافی حدتک رہنمائی کرتا ہے۔

(۶) علامہ بنوریؒ کا فنّی ذوق ہر جلد کے آخر میں ابواب الکتاب کی فہرست تیار کرنے میں نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔مصنف عام شارحین کی طرح صرف عنوان الباب بیان کرنے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے تحت مذکورہ موضوع کا بھی ذکر کرتے ہیں۔اس کے علاوہ اہم مباحث کا بھی خصوصی طور پر تذکرہ کرتے ہیں۔(۷)

معارف السنن شرح سنن الترمذی: کچھ قابل توجہ امور:

(۱) مصنف بعض مواقع پر طویل مباحث میں پڑ جاتے ہیں ۔حالانکہ موضوع الباب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔مثال کے طور پر''اذاتوضأ العبدالمسلم أوالمؤمن فغسل وجهه خرجت من وجهه كل خطيئة'' (۸) کے تحت روح کی حقیقت کے بارے میں لمبی بحث کی ہے۔ اسی طرح فقہ حنفی کے مسائل اصولیہ وفروعیہ کی تشریح میں کافی طویل کلام کرتے ہیں۔جیسے ''مفتاح الصلاة الطهور وتحريمها التكبير وتحليها التسليم'' (۹) کے تحت کافی لمبی بحث کی ہے۔اسی طرح ایک بار میں طلاق ثلاثہ پر فقہی بحث(۹) کافی طویل ہے،''ينزل الله تبارک وتعالى الى السماء الدنيا كل ليلة''۔(۱۰) کی شرح میں طویل کلامی وفلسفیانہ گفتگو کی ہے۔

(۲) بہت سے مواقع پر غموض اور پیچیدگی کا احساس ہوتا ہے۔کیونکہ علامہ بنوریؒ ''معارف السنن'' کی تالیف میں ''العرف الشذي'' کی تفصیل وتشریح کے ساتھ مقید اور پابند ہیں اور ان کا مقصدِ تصنیف علامہ انورشاہ کشمیریؒ کے افادات کی توضیح وتشریح ہے۔

چنانچہ جب آپ کسی موضوع پر کلام کرتے ہیں تو کافی لمبی بحث ہوجاتی ہے کیونکہ اس سے متعلق تمام چیزوں پر اظہار خیال کرتے ہیں۔چنانچہ قاری کو ان منتشر چیزوں پر ذہنی ارتکاز وتوجہ کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔اس کا احساس خود صاحب کتاب کو بھی ہے اس لئے مصنف نے اس کے تدارک کی صورت اس طور پر کی ہے کہ آخرِ بحث میں اکثر آسان اسلوب وپیرایہ میں پوری گفتگو کا خلاصہ پیش کردیتے ہیں۔(۱۲)

تحفۃ الأحوذی شرح جامع الترمذي: کچھ قابل توجہ امور:

(۱) علامہ مبارکپوریؒ اپنی شرح میں کتبِ مآخذ سے مکمل نصوص واقتباسات من وعن نقل کردیتے ہیں۔یہ طریقہ ومنہج علمی اعتبار سے مفید اور بہتر مانا جاتا ہے۔

(۲) صاحب ''تحفۃ الاحوذی''، ''العرف الشذي'' میں موجود غلطیوں اور تسامحات پر صاحب الامالی علامہ انورشاہ کشمیریؒ کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔حالانکہ اس کا سہرا کچھ نہ کچھ ''العرف الشذي'' کے جامع ومرتب ''مولوی محمد چراغ گجراتی قاسمی'' پر بھی جاتا ہے۔کیونکہ جمع وترتیب میں ان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔لیکن علامہ مبارکپوریؒ ان سب کا الزام علامہ کشمیریؒ کے سر تھوپتے ہیں۔اور کبھی کبھی ان پر بہت سخت وترش انداز میں نقد اور طعن کرتے ہیں۔(۱۳)

حالانکہ تنقید کا علمی تقاضا یہ ہے کہ صرف اخطاء واغلاط پر علمی انداز میں گرفت کی جائے ،غلطیوں کی نشاندہی تو کی جائے لیکن ذاتیات کو مطعون ومجروح نہ کیا جائے۔

۳) مصنف نے مذاہب اربعہ کے مقلدین وتبعین پر جابجا بے موقع تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے حالانکہ علمی مباحثہ کا یہ طریقہ واسلوب مستحسن نہیں ہے۔جیسا کہ عصر کی نماز میں تاخیر کے استحباب کی احادیث وروایات کو لے کر علامہ عینی

اور علامہ کشمیریؒ کے دلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ولاتعجبوا من هؤلاء المقلدين أنهم كيف يتركون الأحاديث الصحيحة الصريحة في تعجيل العصر ويتثبتون بمثل هذا الحديث فان هذا من شأن التقليد". (۱۴)

اس تحریر میں مبالغہ آمیزی اور اہانت کا پہلو صاف نظر آرہا ہے۔

(۴) مسلک احناف پر تو خاص طور سے نقد وجرح کرتے ہیں اور ان کے متبعین کو طعن و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ صاحب "تحفۃ الاحوذی" کا امتیاز کہا جا سکتا ہے۔ اور اس موقع پر اکثر وبیشتر جادۂ اعتدال سے ہٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ومع هذا أكثر الأحناف ينقرون كنقر الديك ويتركون تعديل الأركان متعمدين، بل اذا رأوا أحدا يعدل الأركان تعديلا حسنا فيظنون أنه ليس على المذهب الحنفي، فهداهم الله تعالىٰ الى التعديل". (۱۵)

امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت کے ساتھ شارح ترمذی نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ اور ان پر جرح کرتے ہوئے "سيئ الحفظ" جیسے سخت الفاظ تک کہہ گئے ہیں۔ (۱۶) حتی کہ جرح وتعدیل کے عام قواعد وضوابط کا خیال تک نہیں کیا ہے۔ (۱۷)

اسی طرح "تحفۃ الاحوذی" میں علماء حنفیہ پر مصنف نے سخت الفاظ وانداز میں تنقید کی ہے اور کافی سخت لہجہ استعمال کیا ہے جو کہ علمی واخلاقی لحاظ سے کسی بھی طور پر قابل قبول نہیں ہے۔

"بذل المجهود في حل سنن أبي داؤد" کے مصنف مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ولعل صاحب بذل المجهود" عن هذا غافل تذكر تلا......التقريرات المحدود............وكذلك يأتي في أمثال هذه المباحث بالتقريرات المخدوشة ولا يظهر مافيها من الخدشات ولا يشير الى من ردّها، فلاأدرى أنه يأتي بهامع الوقوف على ردّها أو مع الغفلة عن ذلك، فالله تعالى أعلم فان كان لايدري فتلك مصيبة وان كان يدري فالمصيبة أعظم". (۱۸)

ایک جگہ عام احناف پر ان الفاظ میں رائے زنی کرتے ہیں:

"هذا الاشكال الذى ذكره القاضى أبوبكر بن العربى......عسير جدا على الحنفية لايمكن منهم دفعه ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا". (۱۹)

تحفۃ الاحوذی اور معارف السنن سے تقابل وموازنہ کے دو نمونے:

نمونۂ اول: حديث النهي عن استقبال القبلة بغائط أو بول:

امام ترمذیؒ نے پیشاب یا قضائے حاجت کے وقت استقبال واستدبار قبلہ کی ممانعت کے باب میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی حدیث بیان کی ہے:

قال رسول الله ﷺ: "أتيتم الغائط فلا تستقبلوا القبلة بغائط ولا بول، ولا تستدبروها ولكن شرقوا أوغربوا". وقال أبويوب: فقدمنا الشام فوجدنا مراحيض قدبنيت مستقبل القبلة، فنحرف عنها ونستغفر الله......قال أبوعيسى: حديث أبي أيوب أحسن شيئ في هذا الباب وأصح۔ (۲۰)

اس کے بعد امام ترمذیؒ نے اپنی عادت کے مطابق استقبال واستدبار قبلہ کے سلسلہ میں امام شافعیؒ، اسحاق بن راھویہ اور احمد بن حنبلؒ کی آراء ومسالک کو نقل کیا ہے۔ اگلا باب امام ترمذیؒ نے استقبال واستدبار قبلہ کی رخصت کے سلسلہ میں قائم کیا ہے اور اس میں جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابوقتادہؓ اور ابن عمرؓ کی احادیث بیان کی ہیں۔

یہاں پر پہلے دونوں ابواب میں مذکور اقوال ائمہ اور استقبال واستدبار قبلہ کی رخصت کے سلسلہ میں روایات کو پیش کیا جارہا ہے۔

امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ کا استقبال قبلہ کے بارے میں یہ قول نقل کیا ہے:

"انما هذافي الفيامي،فأمافي الكنف المبنية له رخصة في أن يستقبلها،وهكذا قال اسحاق۔

امام احمد کا کہنا ہے:

انما الرّخصة من النبي ﷺ في استدبار القبلة بغائط أو بول،فأما استقبال القبلة فلايستقبلها .(كأنه لم يرفي الصحراء ولافي الكنيف أن يستقبل القبلة). (۲۱)

حضرت جابر بن عبداللہ کی حدیث ہے:

"قال:نهى النبي ﷺ أن نستقبل القبلة ببول،فرأيته قبل أن يقبض بعام يستقبلها"۔(۲۲)

ابوقتادۃ کی روایت ہے:

"أنه رأى النبي ﷺ يبول مستقبل القبلة"۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے:

"قال :رقيت يوما على بيت حفصة فرأيت النبي ﷺ على حاجته مستقبل الشام مستدبر الكعبة"۔(۲۳)

یہاں پر علامہ مبارکپوریؒ اور علامہ بنوریؒ کی بحث کا تقابل وموازنہ پیش کیا جارہا ہے:

(۱) دونوں شارحین ترمذیؒ نے استقبال واستدبار قبلہ کے سلسلہ میں مختلف مسالک وآراء کو پیش کیا ہے۔ لیکن علامہ مبارکپوریؒ نے اس سلسلہ میں مشہور ومعروف مسالک اربعہ کو ہی بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

جبکہ علامہ بنوریؒ نے زیر بحث مسئلہ میں آٹھ مسالک کا تذکرہ کیا ہے۔ چنانچہ عرضِ مسالک میں علامہ بنوریؒ نے علامہ مبارکپوریؒ کے مقابلہ میں زیادہ اہتمام سے کام لیا ہے۔

(۲) ''تحفۃ الاحوذی'' کے مصنف نے ذکرِ مذاہب میں شرح نووی سے خلاصہ نقل کردیا ہے۔ لیکن صاحبِ ''معارف السنن'' نے مسالک وآراء کو حدیث وفقہ کے بنیادی مآخذ سے بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

(۳) صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' نے استقبال واستدبار قبلہ کی حرمت کے قائل فقہاء کے ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کی طرف اشارہ ہی نہیں کیا ہے۔ کیونکہ مصنف نے تو صرف علامہ نوویؒ کا اقتباس نقل کردیا ہے جس میں امام نوویؒ نے حرمتِ استقبالِ قبلہ کے قائل فقہاء وعلماء کے نام تو گنائے ہیں لیکن امام ابوحنیفہؒ کا نام نہیں لیا ہے۔ حالانکہ اس مسئلہ میں مسلکِ حنفی کی رائے واضح طور پر حرمت کے سلسلہ میں ہے۔

انصاف کی بات یہ ہوتی کہ صاحب ''تحفۃ الاحوذی''، ''فتح الباری'' اور دیگر مصادر ومآخذ سے رجوع کرتے تو وہ ایک طرف مسلکِ حنفیہ سے بھی واقف ہوتے تو دوسری طرف زیر بحث مسئلہ میں امام نوویؒ پر استدراک اور علمی اضافہ کرتے۔

(۴) صاحبِ ''معارف السنن'' نے اس موقع پر علماء کے درمیان اختلاف کے منشا اور روایات کے اعتبار سے مدارِ

اختلاف کی نشاندہی کی ہے جس سے طالبینِ حدیث کی فقہی اختلافات کی بنیادوں سے واقفیت بڑھے گی اوران کی علمی بصیرت میں اضافہ ہوگا۔

(۵) دونوں ہی مصنفین نے استقبال واستدبار قبلہ کے سلسلہ میں مسالک وآراء کونقل کرنے کے بعد ہرایک کے دلائل بیان کئے ہیں۔بس فرق اتنا ہے کہ علامہ مبارکپوریؒ نے امام نوویؒ کی شرح مسلم سے منقول اقتباس کے ضمن میں دلائل لکھے ہیں۔اس لئے دلائل کی ترتیب منظّم ومنسّق انداز سپرنہیں ہے۔جبکہ علامہ بنوریؒ نے دلائل کواقوال وآراء کے بعدمرتب انداز میں بیان کیا ہے۔جس سے قاری آسانی وسہولت کے ساتھ مسالک ودلائل پراپنی توجہ مبذول کرسکتا ہے۔

(۶) دونوں ہی شارحین نے کھلی فضا اورعمارت میں استقبال واستدبار قبلہ کی مطلق ممانعت کے قول کوراجح قراردیا ہے اوروجہِ ترجیح اوردوسرے مسلکوں کے مستدلات کا آپس میں تقابل وموازنہ میں بھی تقریباًایک ہی منہج اختیارکیا ہے۔(۲۴)

لیکن یہاں پرعلامہ بنوریؒ کا منہج وانداز قوت ومتانت کے اعتبار سے زیادہ ممتازاور بہترمعلوم ہوتا ہے:

(الف) مولانا بنوریؒ نے مبارکپوریؒ سے زیادہ دلائل پیش کئے ہیں،اولاً کھلی جگہ میں استقبال واستدبار قبلہ سے ممانعت کے سلسلہ میں صریح دلائل پیش کئے ہیں پھراحترامِ قبلہ پرنصوص کو بیان کردیا ہے۔قبلہ روہوکرتھوکنے کی ممانعت کی روایت بھی بیان کردی ہے،حضرت حذیفہ کی حدیث میں ہے:"**من تَفَل تجاه القبلة جاء يوم القيامة وتفله بين عينيه**"۔

(ب) علامہ بنوریؒ نے ابن عمرؓ کی روایت کے سلسلہ میں بحث کی ہے جس میں انہوں نے حضرت حفصہؓ کے گھر کی چھت پرحضورﷺ کوقبلہ کی طرف استنجا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔اوراستقبال قبلہ کے جواز کے قائلین کی یہی سب سے مشہوردلیل ہے۔

مصنف نے یہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی روایت کا سیاق ایک جزئی واقعہ ہےاور یہ کوئی عام قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔شارح ترمذی نے آگے اس کوآپﷺ کی خصوصیت ہونے کے احتمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(ج) علامہ بنوریؒ نے استقبال واستدبار قبلہ کے جواز کے مسلک کی تائید اس طور پر بھی کی ہے ابن حزم جیسے ظاہر روایت پرعمل پیرافقیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔اس کے علاوہ ابن عربی مالکی نے "**عارضة الاحوذی**" میں مختلف وجوہ سے اس کوراجح قرار دیا ہے۔اسی طرح ابن قیم حنبلیؒ نے بھی "**تهذيب مختصر المنذري لسنن أبي دائود**" میں اسی قول کی تائید کی ہے۔

(د) علامہ بنوریؒ اس بحث کے دوران حافظ ابن حجرعسقلانیؒ سے ذراسخت وترش لہجہ میں مخاطب نظرآتے ہیں۔حالانکہ ابن حجر جیسے پایہ کے محدث کے شایان شان یہ ہے کہ ان کی جلالتِ علمی کالحاظ رکھاجائے اورادب واحترام کے ساتھ ان کومخاطب کیا جائے۔

(ہ) صاحب "معارف السنن" نے عِراک کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ کی روایت پرکافی اچھی بحث کی ہے۔وہ روایت ہے:

"**عن عائشة قالت: ذكر عند رسول الله ﷺ قوم يكرهون أن يستقبلوا بفروجهم القبلة، فقال: أراهم قدفعلوها ! استقبلوا بمقعدتي القبلة**"۔

اس روایت کوبھی استقبال قبلہ کے جواز کے قائلین بطوراستدلال پیش کرتے ہیں۔

اس حدیث کے تمام پہلوؤں پرعلامہ بنوریؒ نے گفتگو کی ہے اوراس کوروایت ودرایت اورتعامل امت کے

معیار پر پرکھا ہے۔جس کے بعد یہ صاف ہوجاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت ،حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت (جس میں استقبال واستدبار قبلہ کی صریح ممانعت ہے) کے سامنے قابل عمل وقابل حجت نہیں ہے۔

نمونۂ ثانی: حدیث المسح علی الجوربین والنعلین:

امام ترمذیؒ نے "باب المسح علی الجوربین والنعلین" کے تحت توضأ النبی ﷺ ومسح علی الجوربین والنعلین،قال أبوعیسی:هذاحدیث حسن صحیح" روایت بیان کی ہے۔(۲۵)

ذیل میں علامہ مبارکپوریؒ اورعلامہ بنوریؒ کے اسلوبِ شرح کا باہم تقابلی جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

(۱) علامہ مبارکپوریؒ نے نصِ حدیث کی تشریح سے ابتدا کی ہے اور نعلین پر مسح کے مطلب کی وضاحت کی ہے کیونکہ علماءکواس کے مفہوم میں دشواری وپیچیدگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

علامہ بنوریؒ نے پہلے مسح علی الجوربین والنعلین کے سلسلہ میں علماء کے مذاہب ومسالک کو بیان کیا ہے اور بعد میں حدیث کی تشریح کی ہے۔اگر مصنف مسح نعلین وجوربین کی وضاحت وتشریح پہلے کرتے تو یہ زیادہ بہتر واحسن ہوتا۔

(۲) مسح علی النعلین کا شمار مشکلاتِ حدیث میں ہوتا ہے،دونوں ہی شارحین ترمذی نے اس کے معنی کی وضاحت کی ہے۔اوراس کی توجیہ میں علماء کے آراء کونقل کیا ہے نیز توجیہات بعیدہ کا تعاقب وردبھی کیا ہے۔

اس حدیث کوامام ترمذیؒ نے "حسن صحیح" کہا ہے، بعض علماء کی ایک جماعت نے امام ترمذیؒ کے برخلاف اس روایت کومعلّل اورضعیف قرار دیا ہے۔

اس موقع پر دونوں ہی شارحین اس حدیث پر بہت اچھا نقد کیا ہے اوردونوں نے اس کوضعیف اورمعلول مانا ہے۔امام ابوداؤدؒ، یحیٰی بن معین،علی بن مدینی اورعبدالرحمٰن بن مہدی جیسے ائمہ حدیث سے اس کی تضعیف ہی منقول ہے اورضعف کی وجہ ابوقیس اورحزیل بن شرجیل کا ضعف ہے۔

امام ترمذیؒ کی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی حرج ومضائقہ نہیں ہے کیونکہ ائمہ سابقین کی ایک خاصی تعداد کا یہی قول ہے۔جہاں تک امام ترمذیؒ کی بات ہے توان کا شمار کبارائمہ جرح وتعدیل میں ہوتا ہے۔اگرانہوں نے کسی حدیث کوصحیح قرار دیا ہے توایسا انہوں نے اپنی رائے واجتہاد سے کیا ہے اورمتقدمین ومتاخرین کی ایک معتدبہ جماعت ان سے متفق نظرآتی ہے۔

(۳) علامہ مبارکپوریؒ نے متعددصحابہؓ کے مسح علی الجوربین والنعلین کے سلسلہ میں آثاروأقوال کواختصار کے ساتھ "نصب الرایہ" سے استفادہ کرتے ہوئے بیان کردیا ہے۔

(۴) اس طرح علامہ مبارکپوریؒ نے وفي الباب کے تحت امام ترمذیؒ کے علاوہ بھی مزید احادیث کی تخریج کردی ہے ساتھ میں علل الحدیث پر بھی کلام کیا ہے۔

اورآخر میں اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں جس سے قاری مطمئن ہوجائے "أنّه ليس في باب المسح على الجوربين حديث مرفوع صحيح خالٍ عن الكلام"۔

(۵) دونوں شارحین ترمذی نے ائمہ حدیث کے ذریعہ کسی حدیث میں علّت خفیہ قادحہ کی نشاندھی کے قاعدہ کلیہ کی وضاحت کی ہے جس میں حدیث سند کے اعتبار سے بظاہر صحیح ومقبول معلوم ہوتی ہے۔

مذکورہ حدیث کے نقد میں امام مسلم کا قول ایک قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے "لانترک ظاهر القرآن بمثل

أبي قيس وهُزيل"۔

دونوں کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل دونوں پیروں کو دھونا ہے، جیسا کہ قرآن کی واضح آیت میں صریح حکم موجود ہے (فاغسلوا وجوهكم وأيديكم الى المرافق وامسحوا برؤوسكم وأرجلكم الى الكعبين: المائدہ ٦) اور اس سے حکم عدولی کی بالکل اجازت نہیں ہے الّا یہ کہ اس کے مقابلے میں صحیح احادیث موجود ہوں جن کی صحت پر ائمہ ومحدثین کا اتفاق ہو اور وہ حدّ تواتر تک پہنچتی ہوں۔ جیسا کہ یہاں مسح علی الخفین پر تواتر کی حد تک موجود صحیح احادیث کے سبب عمل کیا جاتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کا قول بھی اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے: "ماقُلتُ بالمسح على الخفين حتى جاء نى مثل ضوء النهار"۔ میں موزوں پر مسح کا قائل اس وقت تک نہیں ہوا جب تک کہ اس کے متعلق حدیثیں روزِ روشن کی طرح مجھ پر آشکار نہیں ہوگئیں۔

جہاں تک مسح علی الجوربین کا مسئلہ ہے تو اس پر تین مرفوع روایات ملتی ہیں اور ان پر بھی ائمہ جرح وتعدیل نے کلام کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کے غسل قدمین کے صریح حکم کی موجودگی میں مسح علی الجوربین پر کیسے عمل کیا جاسکتا ہے؟ (۲۶)

(۷) علامہ مبارکپوریؒ اور علامہ بنوریؒ دونوں حضرات نے اس کی وضاحت کردی ہے کہ جوربین پر مسح کرنے کی علماء وفقہاء نے کچھ قیود وشرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔ (۲۷)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علماء وفقہاء نے پہلے مسح علی الجوربین کی حدیث کو معلّل یا معلول (۲۸) قرار دیا۔ اس کے بعد کچھ شرطوں کے ساتھ اس پر عمل کرنے کی اجازت بھی دے دی؟

علامہ بنوریؒ نے اس کا جواب دیا ہے اور اس پر بہت اچھی فقہی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علماء نے مطلق حدیث پر عمل نہیں کیا ہے بلکہ مسح علی الجوربین کا جواز درحقیقت تنقیح المناۃ (علت) کے طریقہ پر مانا ہے، یعنی جن جوارب میں مذکورہ شرائط پائی جاتی ہوں ان کو خفین ہی میں داخل کرکے اُن پر جواز مسح کا حکم لگایا گیا ہے۔ (ورنہ جن روایات میں مسح علی الجوربین کا ذکر ہے وہ سب ضعیف ہیں، ورنہ کم ازکم خبر واحد ہیں، جن سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی) بلکہ اس کا جواز مسح علی الخفین کی احادیث متواترہ ہی سے تنقیح مناط..... کے طور پر ثابت ہوا ہے۔ (۲۹)

علامہ مبارکپوریؒ کے کلام سے اس مسئلہ کی مزید وضاحت ہوجاتی ہے:

.....فان الجوربين اذاكانا من غير الجلد وكانا ثخينَيْن صفِيقَيْن بحيث يستمسكان على القدمين بلاشد ويمكن تتابع المشي فيهمافلاشك في أنه ليس بين هذين الجوربين والخفين فرق مؤثر، لأنهما في معنى الخفين، وأما اذاكانارقيقين بحيث لايستمسكان على القدمين بلاشد ولايمكن تتابع المشي فهما ليعاني معنى الخفين فلاشك في أن بينهماوبين الخفين فرقا مؤثرا"۔ (۳۰)

(۷) دونوں شارحین نے مسح علی الخفین والجوربین پر ائمہ کے مسالک کو بیان کردیا ہے۔

علامہ بنوریؒ نے مرتب انداز میں خلاصہ پیش کردیا ہے۔ جبکہ صاحب "تحفۃ الاحوذی" نے مسالک اربعہ کے مصادر کتب سے براہِ راست اقتباسات نقل کردیئے ہیں۔ لیکن صاحب "معارف السنن" نے ایک اہم اضافہ کیا ہے جس کا ذکر علامہ مبارکپوریؒ نہیں کرپائے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ نے مرض الموت میں اپنے قول قدیم سے رجوع کرلیا تھا اور امام ابویوسف وامام محمد کا قول اختیار

کرلیا تھا:

"……وروی عن أبی حنیفة الرجوع الی قول صاحبیه قبیل وفاته بأیام،وذلک أنه مسح علی جوربیه فی مرضه ثم قال لعوداه:فعلت ماکنت أمنع الناس عنه ،فاستدلوابه علی رجوعه، کذا"البدائع"و"العنایة"وغیرهما،قال صاحب"الهدایة" :وعلیه الفتور،وأرخ فی مجمع الأنهر،رجوعه بتسعة أیام قبل وفاته ،وقیل بثلاثة أیام....."(۳۱)

(۸) دونوں شارحین ترمذی "جورب" کے تقریباً ایک ہی معنی مراد لیتے ہیں۔البتہ مولانا بنوریؒ نے کافی اختصار سے کام لیا ہے۔جبکہ مبارکپوری صاحب نے تفصیلی بحث کی ہے۔لفظ "جورب" کی تشریح میں اہل لغت اور فقہاء کے اقوال نقل کرنے کے بعد نتیجۂ بحث بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قُلت:یمکن أن یجمع بین هذه التفاسیر المختلفة بأن الجورب هو لفافة الرِّجل کماقاله صاحب"القاموس" من أي شئٍ کان،وأما تقییدهم بالجلدو الصوف و الشعراء وغیر ذلک فعلی حسب صنعة بلادهم،واللہ تعالیٰ أعلم"۔(۳۲)

(۹) علامہ مبارکپوریؒ نے زیر بحث مسئلہ میں ترجیحی قول کو ثابت کرنے میں کمالِ فن کا ثبوت دیا ہے۔آپ نے مسح علی الجوربین کے جواز کے متعلق قول مطلقاً بغیر کسی شرط وقید کے اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس کے متعلق مختلف مسالک واقوال اور دلائل کے تقابل کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سلسلہ میں محتاط مسلک یہ ہے کہ جس طرح کے جورب پر مسح کرنا جائز ہے وہ ایسے دبیز اور موٹے ہوں کہ بغیر کسی چیز کے باندھے ہوئے پیروں پر ٹکے رہیں اور اتنے دبیز اور موٹے ہوں کہ ان کو پہن کر تین میل یا اس سے زیادہ چل سکیں۔لہٰذا مصنف اس طرح کے موزوں پر مسح کے جواز میں ذرا متأمل ہیں۔

علامہ مبارکپوریؒ کا مختلف اقوال وآراء میں کسی ایک رائے کو راجح قرار دینے کا یہ اسلوب ومنہج کافی اہمیت کا حامل ہے جس سے ان کی فقہی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

(۱۰) صاحب "تحفۃ الاحوذی" نے اس مسئلہ میں ان علماء سے بھی مباحثہ ومناقشہ کیا ہے جن کی طرف ان کا فقہی میلان ہے اور اس میں کسی قسم کی مداھنت ومصالحت سے کام نہیں لیا ہے۔علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید علامہ ابن قیم کے مسح علی الجوربین کے جواز کے قول کا علمی طور پر رد کیا ہے۔حتی کہ شمس الحق عظیم آبادیؒ سے جرح کے دوران انصاف سے کام لیا ہے۔ان کی رائے میں جورب پر مسح کرنا اس صورت میں جائز ہوگا جبکہ وہ مجلّد ہوں اور اگر جورب صرف دبیز ہوں لیکن غیر مجلّد ہوں تو ان پر مسح کرنا درست نہیں ہوگا۔لیکن مبارکپوریؒ نے اس سے اختلاف کیا ہے اور ان کا جواب دیا ہے۔(۳۳)

اس پوری بحث کے دوران خاص طور سے علامہ مبارکپوریؒ کے دو امتیازات سامنے آتے ہیں:

(الف) اس موقع پر آپ نے اعتدال اور انصاف کی روح کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔حتی کہ اپنے مسلک کے علماء کی رائے کو اختیار نہ کرکے اس رائے کو ترجیح دی ہے جس پر ان کا علمی ضمیر دلائل کی روشنی میں مطمئن ہوا۔

(ب) پوری بحث اور جرح کے دوران ابتدا ہی سے مثبت ومتوازن تنقید کا رویہ اختیار کیا اور وقار وسنجیدگی کا دامن نہیں چھوڑا۔

اور ایسا جب ہوتا ہے جب محقق دلائل وبراھین کو سامنے رکھ کر تحقیق کرے اور نتائج تحقیق کو من وعن پیش کردے۔اور اگر کسی

سے اختلاف رائے ہو یا اس کی تردید وتغلیط یا بعض غلطیوں کی نشاندھی ضروری ہو تو علم وتحقیق اور تنقید کے اخلاقی اسلوب کا تقاضا ہے کہ اس کے لئے علمی اسلوب اور متوازن تنقید کا طریقہ اختیار کیا جائے اور ذاتیات پر حملہ اور شخصیت کو مجروح نہ کیا جائے بلکہ اس تبصرہ اور جائزہ میں تنقیدی عنصر کا تناسب صحیح اور متعدل ہونا چاہئے۔(۳۴)

حواشی ومراجع

(۱) معارف السنن ۷/ ۴۳۸، ۱/ ۵، ۱۵، ۴۴۔سنن ترمذی کی اہمیت اور صحاح ستہ میں اس کے مقام ومرتبہ پر علامہ بنوریؒ کا ایک وقیع مقالہ دمشق کے مجلّہ المجمع العلمي العربي کے شمارہ جلد ۳۲، جز ۲ رمضان ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۷ء میں شائع ہوکر مقبول خاص وعام ہو چکا ہے۔

(۲) اہل حدیث حضرات کی تاریخ کے لئے ملاحظہ ہو: تحریکِ اہل حدیث تاریخ کے آئینے میں، مؤلفہ قاضی محمد اسلم سیف فیروزپوری، تاریخ اہل حدیث، مؤلفہ محمد ابراہیم برسیالکوٹی، تاریخ اہل حدیث (تین جلدوں میں) ڈاکٹر بہاؤالدین وغیرہ۔ ہند و پاک میں اسی نام سے یہ مسلک جانا جاتا ہے، اہل حدیث حضرات اپنے آپ کو کسی خاص ومتعین فقہی مسلک کے ساتھ منسوب نہیں کرتے ہیں اور براہِ راست قرآن وحدیث سے اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں، فی الواقع یہ مسلک ظاہریہ سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) معارف السنن ۱/۲۔ مولانا بنوریؒ نے ابواب العیدین کے ۵۲/ابواب، ابواب الزکوۃ کے ۳۸/اور ابواب الصوم کے ۳۲/ابواب کی تخریج فرمائی، بحوالہ: بینات یوسف بنوری نمبر، مقالہ حبیب اللہ مختار، حضرت شیخ اور لُبّ اللباب (ص ۲۵۶)۔مولانا بنوری کی ایما پر ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر محمد حبیب اللہ مختار نے "كشف النقاب عمايقوله الترمذي وفي الباب" کے نام سے ترمذی وفي الباب کے تحت احادیث کی تخریج کا کام کیا جو بعد میں پانچ جلدوں میں مجلس الدعوة والتحقيق الاسلامي، بنوری ٹاؤن کراچی سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

(۴) دراسة حديثية عن معارف السنن شرح سنن الترمذي مع مقارنة ب"تحفة الأحوذي"، محمد يحيىٰ بلال مينار، رسالة دكتوراة بجامعة الأزهر، مصر، المكتبة المكية، مكة المكرمة، السعودية، الطبعة الأولى ۲۰۰۶ء، (باب رابع، ص ۶۲۱۔۶۲۳)، جامع الترمذی کی تین شروح العرف الشذي، تحفۃ الاحوذی اور معارف السنن۔مختصر تقابلی مطالعہ، ابوالعاص وحیدی، مقالات سیمینار ۲۰۰۷ء جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ، مرتب مولانا فیروز اختر ندوی۔

(۵) تذكرة محدث العصر علامہ محمد عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ، عبدالرشید عراقی، دارابی الطیب، گوجرانوالہ پاکستان، باب ششم، ص ۲۰۹۔۲۱۳

(۶) نمونہ کے طور پر معارف السنن ۳/۲۔۳ میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت وضع الیدین علی الرکبتین في الركوع کی بحث کو دیکھا جا سکتا ہے، اسی طرح معارف السنن ۲/۳۲۴۔۳۲۵ میں يؤم القوم أقرئهم لكتاب الله کے تحت "الأقرأ" کے مطلب کی تعیین میں اختلافی بحث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

(۷) مولانا محمد یوسف بنوری کی خدمات حدیث معارف السنن کے آئینہ میں، مقالہ رضی الاسلام ندوی، مقالات سیمینار ۲۰۰۷ء (ص ۵۹۷۔ ۶۱۲)، بینات، یوسف بنوری نمبر اشاعت خاص، ۱۹۷۸ء (ص ۸۷۔۱۶۸)، معارف السنن، مکتبہ اشرفیہ دیوبند، ۶/۴۳۴۔۴۳۷

(۸) معارف السنن ۱/۳۹۔۴۲، باب ماجاء في فضل الطهور۔

(۹) ایضاً ۱/۵۴۔۷۴

(۱۰) ایضاً ۵/۴۷۱۔۴۸۱

(۱۱) ایضاً ۴/۱۳۵۔۱۵۶۔

(۱۲) دیکھئے معارف السنن ۲/۳۹۴، ۳۹۵، باب لاصلاة الابفاتحة الكتاب، ۲/۴۴۵ باب وضع اليمين على الشمال في الصلاة، ۲/۴۶۶۔۴۶۸، باب رفع اليدين عندالركوع، ۳/۲۲۰۔۲۲۱ باب القراءة خلف الامام، ۲/۳۹۳۔۳۹۶، باب القارن يطوف طوافا واحداً، ۴/۲۳۶۔۲۳۸ آخر أبواب الوتر وغیرہ۔

(۱۳) تحفۃ الاحوذی ۱/۴۶۷....."فيالله العجب أن هذاالرجل مع غفلته الشديدة ووهمه الفاحش كيف اجترأ على نسبة الوهم الى الحافظ"۔

(۱۴) ایضاً ۱/۴۶۸، باب تعجيل العصر، كتاب الصلاة۔

(۱۵) ایضاً ۱/ ۴۶۹۔

(۱٦) ایضاً ۱/ ۴۲۵، باب فی المستحاضة، کتاب الطهارة ،علامہ مبارکپوریؒ نے اس قول کو حافظ ابن عبدالبر سے منسوب کیا ہے، حالانکہ ابن عبدالبر نے امام ابوحنیفہؒ کا کئی مواقع پر دفاع بھی کیا ہے، علامہ مبارکپوریؒ کو ابن عبدالبر کے دونوں اقوال کا تقابل کرنا چاہئے تھا پھر جرح وتعدیل کے پیمانہ پر جورائے مضبوط ہوتی اس کو اختیار کرنا چاہئے تھا، بحوالہ رسالہ دکتوراہ جامعہ ازھر، محمد یحییٰ بلال منیار، ص ۲۳۳۔

(۱۷) قاعدة في الجرح والتعديل، سبكی، ص ۱۳، ۱۴، ۲۴، ۲۷، ۲۸، بحوالہ رسالہ دکتوراہ، ص ۲۳۲-۲۳۳۔

(۱۸) تحفۃ الاحوذی ۱/ ۳۸۸، باب سؤر الکلب، کتاب الطھارۃ۔

(۱۹) ایضاً ۱/ ۳۸۴، باب الوضوء بالنیۃ، کتاب الطھارۃ۔

(۲۰) سنن ترمذی، باب في النهي عن استقبال القبلة بغائط أو بول، أبواب الطهارة، رقم الحدیث ۸

(۲۱) باب النھي عن استقبال القبلۃ بغائط أو بول۔

(۲۲) باب الرخصۃ فی ذلک، کتاب الطھارۃ، رقم الحدیث ۹

(۲۳) ایضاً، باب الرخصۃ فی ذلک، کتاب الطھارۃ

(۲۴) معارف السنن ۱/ ۹۳-۱۰۲، تحفۃ الأحوذی ۱/ ۲۸۸-۲۹۳

(۲۵) کتاب الطھارۃ، رقم الحدیث ۹۹

(۲٦) امام ابو یوسف کا قول ہے: "انما یجوز نسخ القرآن بالسنة اذا وردت كورود المسح على الخفين في الاستفاضة"، معارف السنن ۱/ ۳۵۰

(۲۷) "جــورب" سوت یا اون کو کہتے ہیں، قاموس میں لکھا ہے کہ "جورب" لفافۂ پاؤں یعنی پیروں کے خول کو کہتے ہیں۔ یہ فارسی لفظ "گورب" کا معرّب ہے (تاج العروس للزبیدی)، اس کو ہمارے یہاں جرّاب (پائتابہ) کہا جاتا ہے۔ جورب کی متعدد صورتیں اور قسمیں ہوتی ہیں۔ اگر موزوں کے دونوں طرف (اوپر نیچے) چمڑا لگا ہوا ہوتو اس کو "مُجلّد" کہتے ہیں، اور اگر صرف نچلے حصے (تلوے) پر چمڑا لگا ہوا ہوتو اسے "مُنعّل" کہتے ہیں اور اگر موزے پورے کے پورے چمڑے کے ہوں، یعنی سوت وغیرہ کا ان میں بالکل دخل نہ ہو تو ایسے موزوں کو "خفین" کہتے ہیں۔ خفین، جوربین مجلّدین اور جوربین منعّلین پر باتفاق مسح جائز ہے، اور اگر جوربین مجلّد یا منعّل نہ ہوں اور رقیق ہوں، یعنی ان میں ثخین کی شرائط نہ پائی جاتی ہوں تو ان پر مسح باتفاق ناجائز ہے، البتہ جوربین غیر مجلّدین وغیر منعّلین ثخین پر مسح کرنے کے بارے میں اختلاف ہے، ثخین کا مطلب یہ ہے کہ ان میں تین شرائط پائی جاتی ہوں (۱) شفاف نہ ہوں یعنی اگر ان پر پانی ڈالا جائے تو پاؤں تک پہنچے۔ (۲) مستمسک بغیر استمساک ہوں یعنی بغیر کسی چیز سے بندھے ہوئے پنڈلیوں پر کھڑے رہیں۔ (۳) ان میں تتابع مشی ممکن ہو کہ اتنے دبیز اور موٹے کپڑے کے ہوں کہ ان کو پہن کر کم سے کم ایک فرسخ (تین میل) کا فاصلہ پیدل طے کیا جاسکتا ہو۔ تفصیل کیلئے دیکھئے: معارف السنن ۱/ ۳۴۷، تحفۃ الأحوذی ۱/ ۲۸۸، درس ترمذی ۱/ ۳۳۴-۳۳۵

(۲۸) معلول یا معلّل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی سند یا متن میں کوئی علّت خفیہ قادحہ پائی جائے، خواہ اس کے تمام رجال ثقات ہوں، یہ حدیث کی مشکل اور دقیق ترین قسم ہے، کیونکہ حدیث کے علل کا پہچاننا بہت مہارت اور تجربہ کا متقاضی ہے۔ "فالحديث المعلل هو الحديث الذي أُطلع فيه على علة تقدح في صحته مع أن ظاهره السلامة منها، ويتطرق ذلك الى الاسناد الذي رجاله ثقات الجامع شروط الصحة من حيث الظاهر ......" (مقدمۃ ابن الصلاح فی علوم الحدیث، ص ۷۰)۔

(۲۹) معارف السنن ۱/ ۳۵۰۔

(۳۰) تحفۃ الاحوذی ۱/ ۴۰۱۔

(۳۱) معارف السنن ۱/ ۳۴٦-۳۴۷، باب في المسح على الجوربين والنعلين، کتاب الطھارۃ۔

(۳۲) تحفۃ الاحوذی ۱/ ۴۰۰۔

(۳۳) پوری بحث کو تفصیل سے دیکھنے کیلئے رجوع کریں معارف السنن ۱/ ۳۴٦-۳۵۰، تحفۃ الاحوذی ۱/ ۳۹٦-۴۰۳

(۳۴) اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، ترجمہ از عربی، سید سلمان حسینی ندوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ص ٦

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

محرومی

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

یہ طریقہ اوپر ذکر کیے گئے طریقہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، وہاں بچے کو کچھ دینے سے محروم کرنا تھا اور اس طریقہ میں بچہ جب کوئی نامناسب حرکت کرے تو اس کو دی گئی کوئی چیز واپس لے لی جاتی ہے، عام طور پر اس کا پسندیدہ کھلونا لیا جاتا ہے حالانکہ اس کی اس حرکت کا کھلونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، لیکن پھر اس وجہ سے اس کے اندر عناد مخالفت اور جھگڑے کی نفسیات پیدا ہوتی ہیں، اس کے بالمقابل اس نے اگر اپنی کسی چیز سے گھر کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا ہے، مثلاً اس نے گیند سے کھیلتے ہوئے کسی چیز کو نقصان پہنچایا، جبکہ ماں اس کو بار بار منع کر رہی تھی، تو ایسے موقع پر ماں کے لیے ممکن ہے کہ گیند لے کر کسی ایسی جگہ رکھ دے کہ بچے کو نظر تو آئے مگر اس تک اس کا ہاتھ نہ پہنچے، اس طرح وہ اپنے برتاؤ اور اس کے نتیجہ میں گیند سے محرومی سے متعلق سوچے گا، اس کی بھی کوشش کیجئے کہ آپ نے اس سے جو چیز لی ہے اس سے اس کو لمبی مدت تک محروم نہ رکھیے، چند گھنٹے یا بہت ضروری ہو تو دن دو دن سے زیادہ محروم نہیں رکھنا چاہیے۔

۵- کھانے سے محروم کرنا:

کھانے سے محروم کرنے کا طریقہ استعمال کرنے کی رائے نہیں دی جاسکتی اگرچہ بعض معاشروں میں یہ طریقہ بھی مستعمل ہے، یہ صحیح ہے کہ ایک صحیح وسالم بچے کو اگر ایک وقت کے کھانے سے محروم کر دیا جائے تو نہ اس کی صحت کو کوئی نقصان ہوگا اور نہ اسے کوئی تکلیف پہنچے گی، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کھانے کے مسئلہ میں بچہ اپنے والدین پر اعتماد کرتا ہے، اس لیے یہ بات انصاف وحکمت کے خلاف ہوگی کہ ایک ایسے عمل کے ارتکاب کے سبب اس کو کھانے سے محروم کر دیا جائے جس عمل کا کھانے سے کوئی تعلق نہ ہو، اس طریقے سے والدین اور اولاد کے درمیان کبھی بھی محبت واعتماد کا مضبوط تعلق قائم نہیں ہوگا۔

۶- بچے پر جرمانہ لگانا:

بعض حلقوں میں یہ طریقہ بھی مستعمل ہے بایں طور کہ بچے کو کسی کام یا کسی ایسی چیز کا مکلّف بنایا جاتا ہے جس کو وہ پسند نہیں کرتا، جیسے کچن کے برتن دھونے یا حمام صاف

کرنے یا فرش پر پوچھا لگانے کا اس کو مکلّف بنایا جائے، سزا کے لیے عام طور پر اس طریقے کی تلقین نہیں کی جاتی، اس لیے کہ ہم نہیں چاہتے کہ بچہ گھر کے کاموں کو سزا تصور کرنے لگے یا ناپسندیدہ کام شمار کرنے لگے، جبکہ یہ تمام کام زندگی میں بنیادی کاموں کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں انجام دینا ضروری ہوتا ہے، بہتر تو یہ ہوتا ہے کہ بچہ ان کاموں میں مثبت انداز میں اہل خانہ کا ہاتھ بٹائے، جس میں نہ اس کی بدسلوکی کا کوئی دخل ہو اور نہ سزا کا، بلکہ بچہ خود اپنے ادارے سے ان کاموں میں والدین کی مدد کرے، اپنے کمرے اور اپنے صندوق کی ترتیب وتنسیق کرے۔

یہ طریقہ عام طور پر مدارس کے ابتدائی درجات میں مستعمل طریقہ کے مشابہ ہے، جہاں بچے کو کچھ اضافی کام دے دیا جاتا ہے، ٹیچر کو پریشان کرنے یا درجہ میں شور کرنے کے سبب اسے ایک آدھ صفحہ نقل کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے۔ عام طور پر فن تربیت کے ماہر علمائے نفسیات اس طریقہ کا مشورہ نہیں دیتے جس سے بچہ لکھنے سے ہی متنفر ہونے لگتا ہے، کیونکہ اس کو لگتا ہے کہ لکھنے کا عمل سزا سے قریب تر ہے۔

۷-ٹی وی/موبائل دیکھنے سے منع کرنا:

مثلاً اگر بچہ بہت زیادہ ٹی وی دیکھنے کا شوقین ہے، تو سزا کا متوقع طریقہ یہ ہوگا کہ اس کو ٹی وی پر اس کا پسندیدہ سیریل نہ دیکھنے دیا جائے یا مطلق طور پر ایک یا دو دن کے لیے ٹی وی دیکھنے پر پابندی لگا دی جائے، یہاں بھی میں وہی بات دوہراؤں گا کہ سزا ہمیشہ اس عمل سے قریب تر ہونا چاہیے جس کا بچے نے ارتکاب کیا ہے ورنہ پھر وہ سزا کو ظلم اور غیر منصفانہ تصور کرے گا، بچہ چونکہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے کسی بڑے، والدین یا اساتذہ کے سایۂ رحمت وعاطفت میں گذارتا ہے، اس لیے بڑے اس کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں اس میں وہ ''عدل'' پر خاص توجہ دیتا ہے، اس پر خاص دھیان دینا چاہیے تاکہ وہ اس طرح پروان چڑھے کہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرے، ہر ایک کا واجب احترام کرے اور ہر ایک سے مثبت انداز میں پیش آئے، اس لیے جب آپ تادیب وسزا کا ارادہ کریں تو پورے طور پر محبت واحترام اور انصاف کا لحاظ رکھیں، اللہ کا ارشاد ہے ولا یجرمنکم شنئان قوم علی ألا تعدلوا، اعدلوا هو اقرب للتقوى (المائدہ ۸)

چنانچہ مثلاً بچے کسی ایک پروگرام کو دیکھنے پر متفق نہ ہوں، ہر ایک الگ الگ پروگرام دیکھنے پر بضد ہو، تو ماں کو چاہیے کہ ٹی وی بند کردے، ان کے اختلاف اور آپسی جھگڑے کے سبب سب کو محروم کردے، پھر جب تک وہ آپس میں اتفاق نہ کرلیں تب تک دوبارہ نہ چلائے، اس صورت میں منع کرنے اور محروم کرنے نیز بچوں کے عمل کے درمیان واضح ربط وتعلق نظر آئے گا۔

دوسری صورت بچے کو ٹی وی سے محروم کرنے کی یہ ہوتی ہے کہ ٹی وی دیکھنے کے لیے اسکول کا ہوم ورک نہیں پورا کرتا ہے، ایسے موقع پر ٹی وی بند کرنا ممکن ہوتا ہے، کہ پہلے وہ اچھی طرح اسکول کا کام کرے، پھر آکر ٹی وی دیکھے، نیز ٹی وی کو محض اسی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ گھر کے دیگر سامانوں کی طرح ایک سامان ہے، سبھی کو اسے مناسب وقت

اور مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہیے، اس کو نہ ہی معاوضہ کا سامان بنا کر رکھنا چاہیے اور نہ سزا کا ذریعہ۔

۸- برتاؤ کی تحسین (Admiration / Appreciation) نہ کرنا:

یہ اور آئندہ مذکور دو طریقوں کو تربیت و تادیب کے طریقوں میں بہت موثر و فعال سمجھا جاتا ہے، عام طور پر ہم لوگ بچے کے مزاج، والدین کی معلومات اور حالات کا اندازہ کر سلوک و برتاؤ کی تحسین و تائید نہ کرنے کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ اگر نامناسب حرکت کرے تو اس پر رضامندی نہ ظاہر کی جائے، اس کی موافقت نہ کی جائے اور نہ ہی کسی قسم کی تحسین و حوصلہ افزائی کی جائے، یقیناً آپ کا بچہ آپ کی خوشی، رضامندی اور تحسین کا خواہاں ہوگا، وہ آپ سے سیکھے گا کہ صحیح کیا اور غلط کیا ہے، اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ اس کو بتائیں کہ آپ کو کس برتاؤ سے انقباض ہوتا ہے اور کس رویّے کی آپ تحسین نہیں کر سکتے، آپ اس کو بتایئے کہ جو بھی اس طرح کا عمل کرے آپ اس کی تحسین نہیں کر سکتے، اس کا اس کی زندگی میں، اس کے رویّوں پر اور اس کے تصرفات پر بڑا اثر ہوگا، یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ آپ اس کو بحیثیت انسان نہیں ناپسند کر رہے ہیں، بس صرف اس کے برے سلوک کو قبول نہیں کر رہے ہیں، بحیثیت انسان اس کی عدمِ تحسین مقصود نہیں بلکہ صرف غلط برتاؤ اور نازیبا و ناروا سلوک کی عدمِ تحسین مقصود ہے، بحیثیت انسان آپ اس کو اچھی طرح قبول کیجئے، دھیان رکھیئے کہ آپ کو اسے یہ احساس نہیں دلانا ہے کہ وہ ایک ''بُرا انسان'' ہے، بلکہ اس کو یہ احساس دلانا ہے کہ وہ ایک مقتدر انسان ہے، اس کے اندر خود یہ قدرت و صلاحیت ہے کہ وہ غیر مقبول عمل اور نازیبا سلوک سے خود اجتناب کر سکے، اس لیے آپ کو کوشش یہ کرنا ہے کہ آپ صرف اس متعین کام کی تردید کریں جس کو پسند نہیں کر رہے ہیں نہ کہ اس کی شخصیت کی، جیسا کہ ہم دوسری جگہ لکھ آئے ہیں، آپ اس سے مثلاً یہ کہیے ''یہ جو کام تم نے کیا ہے یہ اچھا کام نہیں ہے''، یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ آپ اس سے یہ جملہ کہہ دیں ''تم اچھے لڑکے نہیں ہو''، آپ اس سے اس طرح کہیے: ''یہ کام پریشان کن ہے، اس میں بڑا ہنگامہ ہے'' بجائے اس کے کہ آپ اس سے یہ کہیں ''کہ تم بہت پریشان کن لڑکے ہو بہت شور مچاتے ہو''۔

اس طرح کے جملوں سے آپ اس کو یہ بتانے میں کامیاب ہوسکیں گے کہ اس کی شخصیت اور عمل دونوں الگ الگ ہیں، دونوں ایک نہیں، البتہ وہ صاحب اختیار ہے، اس کو قدرت حاصل ہے کہ سلوک و عمل کا طریقہ منتخب کرے، یہ صحیح ہے کہ وہ سلوک و عمل پر ابھی مکمل کنٹرول نہیں رکھتا لیکن درحقیقت آپ اس کو اس راستے پر چلانا چاہتے ہیں جس پر چل کر وہ نفس پر قابو پانا سیکھے، مناسب طریقے اختیار کرنا سیکھے، کیونکہ انسان اپنے اختیار و رغبت کے اعتبار سے ہی راستہ کا انتخاب کرتا ہے۔

کسی بھی بچے بلکہ کسی بھی انسان کے لیے سب سے زیادہ نقصان دہ بات یہ ہے کہ اس کو منفی صفات سے متصف کر دیا جائے اور بار بار دوسروں سے بھی وہ وہی سنتا رہے، جس کا نتیجہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس حال میں بڑا ہو کہ وہ خود ہی ان منفی صفات کی تصدیق و تائید کرنے لگے، مثلاً وہ یوں کہے ''میں برے کام کرتا ہوں کیونکہ میں برا بچہ

ہوں جیسا کہ میرے والد مجھے کہتے ہیں''۔

بچے کے لیے جو بات معاون ہوسکتی ہے اور جس سے بچہ خود ہی نامناسب افعال سے کنارہ کش ہوسکتا ہے وہ یہ کہ آپ بچے کے سامنے افعال کی کیفیت واضح کیجئے، اور اس کو یہ سمجھائیے کہ آپ اس کام کو کیوں نہیں بہتر سمجھتے، یہ صحیح ہے کہ آپ کو جلدی ہوگی، تفصیلات کا آپ کے پاس وقت نہیں ہوگا، لیکن یہ یاد رہے کہ اگر آپ نے ذرا سا بھی وقت خرچ کیا اور اس کے سامنے بات واضح کردی تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا، اگر بچے میں اس کی استطاعت ہے تو آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود ہی عدمِ استحسان اور نامناسب عمل کے اسباب تلاش کر کے بتائے، اور پھر اس سلسلہ میں مقبول و پسندیدہ امر کی نشاندہی کرے، اس طرح آپ بیک وقت کئی فائدے حاصل کریں گے، ایک تو آپ اس کے اندر سلوک وعمل کے متعلق سوچنے کی صلاحیت پیدا کریں گے، اچھی طرح محاکمہ کرنے کی صلاحیت پیدا کریں گے، آپ اس کو یہ سکھائیں گے کہ خود ہی اپنے بارے میں سوچے، بجائے اس کے کہ ہر وقت کوئی اس کو تلقین کرتا رہے، پھر اس عمل سے آپ کے اور بچے کے درمیان اعتماد، مفاہمت اور احترام کے ساتھ مضبوط تعلق استوار ہوگا۔

۹-عمل کے لازمی اور طبعی نتائج:

سزا کے بہترین طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ بچے کو چھوڑ دیا جائے وہ خود ہی اپنے عمل کا نتیجہ دیکھے اور جھیلے، لیکن یہ تب ہی ہوسکتا ہے جب حالات پرامن ہوں اور یہ طریقہ اختیار کرنا ممکن ہو، ذاتی تجربات سے بہتر کوئی اور معلم نہیں، بچہ خود اپنی خطاؤں سے سلوک وعمل کا افضل طریقہ سیکھے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کو تکلیف دہ انجام کے لیے چھوڑ دیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ آپ اس کو یہ تکلیف دہ انجام محسوس کرنے دیں، چنانچہ جب آپ کو لگے کہ اس نے محسوس کرلیا ہے تو پھر اس کی مدد کے لیے مداخلت کیجئے، اس طور پر اس کی مدد کیجئے کہ وہ اپنے عمل اور نتیجۂ عمل جو ظاہر ہو اس میں ربط وتعلق دیکھے، یہ طریقہ بلاشبہ منصفانہ طریقہ ہے، اس میں سزا کا اظہار کم ہے، یہ طریقہ ایک معلم ایک مرشد کے قائم مقام ہے جو گویا بہترین نصیحت وخیر خواہی کررہا ہے، اسی فصل میں ہم اس طریقے کی مثالیں ذکر کرچکے ہیں۔

۱۰-کمرے کے کسی ایک حصہ میں بٹھادینا:

اگر آپ شدید طور پر محسوس کرتے ہیں کہ کسی مادی وجسمانی سزا کی ہی ضرورت ہے، تو بس یہ کافی ہوگا کہ آپ کمرے میں کسی متعین کونے، متعین کرسی پر بچے سے بیٹھنے کا مطالبہ کریں، کہ وہ کچھ وقت تک اسی پر بیٹھا رہے، بہت سے والدین کمرے میں کسی کونے میں اس طرح کی کرسی اسی استعمال کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں، چنانچہ آپ بچے سے اطمینان مگر پختہ ارادے کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جا کر اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور بالکل بھی کوئی حرکت نہ کرنا، اور جب تک کہا نہ جائے وہاں سے نہ اٹھنا، عام طور بچہ تھوڑی دیر بیٹھے گا، لیکن جب دیر ہوگی تو وہ اکتائے گا، ادھر اُدھر حرکتیں اور شور کرنا شروع کردے گا، پھر اہل خانہ حیرت میں پڑ کر سوچیں گے کہ اب کیا کریں؟

یہ ضروری ہے کہ جب آپ یہ طریقہ استعمال کریں تو بچہ محسوس کرے کہ آپ اس کو دیکھنے میں پوری طرح

سنجیدہ اور چاق و چوبند ہیں اور اس پر توجہ دے رہے ہیں، بلاشبہ وہ کرسی یا کمرے کے گوشے سے بھاگنے کے لیے ہر طرح کے وسائل استعمال کرے گا اور دھوکہ دینے کی کوشش کرے گا، کبھی وہ کہے گا کہ پیاس لگی ہے، کبھی وہ سونے کا بہانہ کرے گا، کبھی حمام جانے کو کہے گا، اگر آپ کو لگتا ہے کہ واقعی اسے حمام جانے کی ضرورت ہے تو آپ اسے اس شرط پر جانے کی اجازت دیجئے کہ وہ واپس آکر پورے سکون سے اسی کونے میں متعین وقت تک بیٹھے گا، اس کو بتا دیجئے کہ جس دوران وہ چیخے چلائے گا یا روئے گا وہ وقت شمار نہیں ہوگا، پھر وہ خود ہی اس مختصر وقت کا منٹ منٹ شمار و حساب شروع کردے گا جس میں وہ خاموش رہا، لوگ تعجب کریں گے کہ اس آسان اور سادہ سے طریقے کا بچے کے سلوک و عمل پر کیسا زبردست اثر پڑتا ہے، اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بچے کا میلان حرکیت و نشاط کی طرف ہوتا ہے، اب بغیر کسی حرکت و نشاط اور آزادی کے ایک جگہ پر اس کا بیٹھنا اس کے لیے بڑا سخت کام ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ سکون سے اس طرح بیٹھنے کے دوران وہ اپنی اس حرکت کے بارے میں غور و خوض کرے جس کی اسے سزا ملی ہے، اس کے اندر یہ بھی خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ آپ نے اس کے سلوک و برتاؤ کی تحسین نہیں کی جبکہ وہ آپ کا ''فرمانبردار'' بچہ بننا چاہتا تھا، پھر وہ دیکھے گا کہ آپ اس کے عمل کی تصحیح و تحسین میں پرعزم اور سنجیدہ ہیں، سزا کے اس طریقہ میں والدہ اور خود بچے کو سکون کا سانس لینے اور اعصاب کو مطمئن کرنے میں مدد ملے گی، جس سے مخصوص و متعین وقت پورا ہونے کے بعد اچھی طرح پرسکون گفتگو میں بھی مدد ملے گی، اور یہ مشکل آگے بڑھنے کے بجائے اسی حد تک محدود رہے گی۔

بچہ جب کمرے کے کسی کونے میں بیٹھا ہو تو اس کو کمرے میں بالکل تنہا چھوڑ دینے اور بچے سے کلی طور پر کنارہ کشی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اس لیے اس دوران بہتر یہی ہے کہ متعین وقت ختم ہونے سے پہلے ماں اس سے گفتگو نہ کرے، لیکن کمرے میں ہی رہے اور اپنے روٹین کے کاموں میں لگی رہے، پھر جب یہ متعین وقت ختم ہوجائے تو بہتر ہوگا کہ گھر میں نارمل اور فطری ماحول ہو، اس طرح یہ مسئلہ یہیں پر ختم ہوجائے گا اور بچہ اپنے سلوک و عمل اور برتاؤ سے متعلق بعض اسباق حاصل کرلے گا، بس یہی کافی ہے، اس کے بعد اس سلسلہ میں آپ لمبی چوڑی گفتگو سے بچنے کی کوشش کیجئے۔

☆☆☆

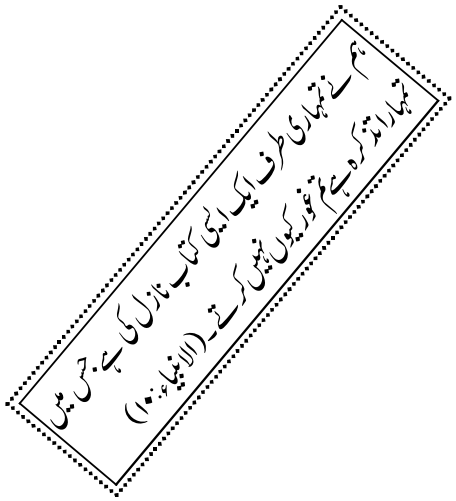

❑ نقطۂ نظر

داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

ہندوستان میں مسلمانوں کی صورت حال ایسے مرد بیمار کی طرح ہے جو وٹلیٹر پر ہو، ایسے مرد بیمار کے لئے معالجین بہت سے نسخے تجویز کرتے ہیں لیکن عوام ہی نہیں خواص اور تعلیم یافتہ لوگ بھی انگشت بدنداں ہیں کہ کام کہاں سے شروع کیا جائے اور نقطہ آغاز کیا ہو اور کس طرح ہو کہ ہندوستان کا مرد بیمار صحتیاب ہو جائے۔ مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی معیار بھی بلند کرنا ہے انہیں متحد اور منظّم بھی کرنا ہے انہیں صحت مند اور تندرست بھی رکھنا ہے، مسلمانوں کی تعلیم کی طرف بھی توجہ کرنی ہے، مسلمانوں کی اقتصادی حالت بھی درست کرنی ہے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو نفرت کی دیوار کھڑی ہو چکی ہے اسے گرانا بھی ضروری ہے برداران وطن کو اسلام اور مسلمانوں سے مانوس بھی کرنا ہے۔ دشمنوں کو اپنی کامیابی سے مایوس بھی کرنا ہے۔ ملت کے اطباء اور معالجین بار بار مرد بیمار کی نبض ٹٹول رہے ہیں اور مختلف قسم کے نسخے تجویز کر رہے ہیں لیکن علاج نہیں شروع ہوتا ہے۔ یہ سارے نسخے اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن سوالیہ نشان یہ ہے کہ یہ سارے کام کیسے شروع ہوں۔ ملک بہت بڑا ہے اور ملت اپنی تعداد اور افرادی قوت میں کئی ملکوں کے برابر ہے۔ اگر کام نہیں ہوا تو اندیشہ ہے کہ اسپین کی طرح یہاں بھی داستان ختم ہو جائے گی۔

مندجہ بالا سارے کام بیک وقت پورے ملک میں شروع ہو سکتے ہیں اگر مسلمان اپنی مسجدوں کو اپنے تعمیری کاموں کا مرکز بنالیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینۃ منورہ پہونچ کر جس مسجد نبوی کی تعمیر کی تھی وہ صرف نماز کے لئے نہ تھی، وہ درسگاہ بھی تھی، وہاں مسلمانوں کے اجتماعی معاملات طے کئے جاتے تھے، مشاورت ہوتی تھی، وہ دارالقضاء بھی تھا، وہ عدل وانصاف کا مرکز بھی تھا، باہر سے وفود بھی آتے تھے اور وہاں ٹھہرتے تھے وہ مہمان خانہ بھی تھا، آپ وہاں غیر مسلموں سے ملاقات بھی کرتے تھے وہ مسجد مسلمانوں کی تمام سماجی سرگرمیوں کا مرکز تھی مسلمانوں کے تمام مسائل کے حل کے لئے مسجد میں مشاورت کی جاتی تھی، لوگ وہاں جمع ہوتے، شادی اور نکاح کی تقریبات

منعقد ہوتی تھیں۔مسجدیں مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان ہوتی تہیں، اصلامسجد وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی اجتماعیت نشو نما پاتی ہے ترقی اور نہضت کے راستے کھلتے ہیں، بدقسمتی سے مسجدوں کا اجتماعی کردار ختم ہوگیا ہے،نماز کے ختم ہوتے ہی مسجدوں میں تالا لگ جاتا ہے جماعت سے نماز کے ختم ہونے کے بعد کوئی مسافر آئے اور نماز پڑھنا چاہے تو اللہ کا گھر بند دیکھ کر واپس ہوجائے۔سعودی عرب جیسے ملکوں میں تو حکومتیں عوام وخواص کے باہم ملنے سے خوفزدہ ہوتی ہیں کہ لوگ کہیں حکومت پر تبصرہ نہ کریں اور رائے عامہ حکومت کی مخالف نہ ہوجائے۔ ان تمام ملکوں میں جہاں استبدادی غیر جمہوری نظام قائم رہتا ہے حاکم اپنی رعیت سے ڈرتے ہیں، ان ملکوں میں فرض نماز کے بعد تھوڑی دیر کے اندر مسجدوں کے دروازے مقفل ہوجاتے ہیں کسی راہگیر اور مسافر کو نماز پڑھنی ہو تو اسے ہر مسجد بند نظر آئے گی، وہ بیچارہ سڑک پر اور فٹ پاتھ پر نماز پڑھنے پر مجبور ہوگا اور باوضو نہیں ہے تو یہ بھی نہیں کرسکے گا۔مسجد میں تالا بندی اور لاک ڈاون کا طریقہ کار قرآن کی آیت ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان یذکر فیه اسمه وسعی فی خرابها کی تہدید کے دائرہ میں آتا ہے یہ عذر لنگ ہے کہ چوریاں ہوتی ہیں ۔مسجد کے متولیوں کو اس آیت کی سنگینی اور کلام الٰہی کے جلال کا اندازہ ہی نہیں ہے اگر وہ اس کا اندازہ کرتے تو کم ازکم مسجد کا ایک حصہ اور طہارت خانہ ضرور کھلا رکھتے ۔آیت کا ترجمہ یہ ہے ''اس شخص سے بڑھکر ظالم اور کون ہوگا جس نے اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے روکا اور مسجد کو ویران کرنے کی کوشش کی'' ۔مسجد صرف فرض نمازوں کے لئے نہیں ہوتی ہے اس لئے ہوتی ہے کہ جو شخص جس وقت چاہے اس میں نماز پڑھے۔جو متولی اس میں رکاوٹ ڈالے گا اس کو خدمت نہیں بدخدمتی کی سزا ملے گی اسی آیت میں ہے کہ اس کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب کی بشارت ہے۔

یادش بخیر مولانا عبدالکریم پاریکھ اس صورت حال سے کبیدہ خاطر ہوتے اور جب دیکھتے کہ مسجدوں کے امام اور متولی قرب وجوار کے غیر مسلموں کو مسجد کے احاطہ میں آنے سے اور اپنی ضرورت پوری کرنے سے روکتے ہیں تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے کہ غیر مسلم جب بھی اسلام قبول کرتا ہے وہ پہلے مسلمانوں کے ماحول سے مانوس ہوتا ہے اب مسجد کے ذمہ دار اسے مسجد سے مانوس ہی نہیں ہونے دیتے ہیں جب غیر مسلم مانوس نہیں ہوں گے تو پھر مسلمان ضرور ان سے شکوہ سنج اور مایوس ہوں گے۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ محلّہ کے غیر مسلموں کو مسجدوں میں آنے اور جمعہ کا خطبہ سنے اور نماز کو دیکھنے کی دعوت دی جاتی۔افسوس کہ مسجدیں بے فیض ہوگئی ہیں اور جمعہ کے خطبات مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کے لئے کوئی افادیت نہیں رکھتے ہیں۔یہ سب غلط بینی ہے منبر کی اور واعظان پیشہ ور کی۔انہوں نے باہر کی دنیا کو اپنا حریف اور رقیب سمجھ لیا ہے۔مساجد کے امام اور متولیوں نے مسجد کے تعمیری کردار کو بدل کر رکھدیا ہے۔

لیکن اب ایک نئی تحریک سامنے آئی ہے ایک نیا منظر نامہ ہے ایک انقلابی تصور ہے جس کا نام ہے Masjid as a comunity centre یعنی مسجد کمیونیٹی سنٹر کے طور پر یعنی مسجد نبوی کے تاریخی کردار

کی تجدید۔اس مسجد میں دینی اور دعوتی کام بھی ہوگا درس قرآن اور درس حدیث بھی ہوگا حالات حاضرہ کا تعارف بھی ہوگا تعلیم کے فروغ کی کوششیں بھی کی جائیں گی ہر طرح کی سماجی خدمات بھی انجام دی جائیں گی صحت اور تندرستی کی طرف بھی توجہ دی جائے گی بے روزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کی طرف بھی توجہ دی جائے گی مسجد کے گرد ونواح میں جتنے برادران وطن ہیں ان سے روابط اور تعلقات قائم کئے جائیں گے ان کو مسجد میں بلایا جائے گا ان کو اسلام سے مانوس کرنے کا منظم کام کیا جائے گا یعنی مذہبی سماجی اور دعوتی کاموں کے لئے کمیٹیاں بنالی جائیں گی۔

ابھی حیدرابادشہر میں یہ کام چند افراد ایک عالم ربانی کی سرپرستی میں انجام دے رہے ہیں اور ابھی دائرہ محدود ہے لیکن جب یہ کام پھیلے گا اور یہ پودا برگ وبار لائے گا اور تنا ور درخت بن جائے گا اور ہندوستان کے کونے کونے تک اس کی شاخیں پھیلیں گی تو اسلام کا خزاں آلودہ درخت بہار آشنا ہوجائے گا۔اگر ایک طرف مساجد کو مسجد نبوی کے طرز پر تمام اجتماعی تعلیمی دینی دعوتی سماجی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا جائے دوسری طرف دینی مدارس کا نصاب ایسا تیار کرلیا جائے کہ وہاں سے فارغین لسان قوم میں پوری قوم سے خطاب کرنے کے لائق بن جائیں اور برادران وطن کے عقیدہ اور مذہب سے آشنا ہوں تو ملک میں انقلاب انگیز تبدیلی آسکتی ہے لیکن اگر مسلمان صرف حکومت کی زیادتیوں کا ماتم کرتے رہے اور مثبت کاموں سے جی چراتے رہے تو ان کی قسمت میں ہمیشہ نوحہ گری آتی رہے گی اور وہ یہ شعر پڑھتے رہیں گے۔

حیراں ہوں دل کو روؤں یا پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

ایک اہم اور خاص الخاص بات جو اس تحریک کی ہے وہ یہ کہ اس کی قیات ایک عارف باللہ روحانی شخصیت کے ہاتھ میں ہے۔عقل کے نقیب اور تصوف کے رقیب حضرات کے نزدیک یہ خصوصیت بے معنی ہوگی وہ سمجھتے ہوں کے کہ صرف عقل کو خطاب کرنے اور دلیلوں کا انبار لگا دینے سے ہوا کا رخ بدل جائے گا اور شرک پر توحید غالب آجائے گا۔ یہ خیال درست نہیں اگر چہ کہ عقل اور دلائل کی بھی اہمیت ہے اور اس دور میں لٹریچر کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ تاریخی پس منظر ذہن میں رہنا چاہئے کہ ہندوستان جیسے شرک کے بڑے قلعہ کو اسلام کی سرپرستی اور نگہبانی میں ڈالنے میں تصوف نے بڑا کردار ادا کیا ہے اگر مسلمان حکمرانوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا ہوتا اور اسلام کے لئے دلوں کی استمالت کی کوشش کی ہوتی تو آج اجودھیا میں رام مندر تعمیر نہ ہوتا اور نہ بابری مسجد گرائی جاتی۔آج بھی اپنی دعوت کو مؤثر اور دلنشین بنانے میں تزکیہ نفس اور روحانی طاقت کا حصول ضروری ہے اصل کام یہ ہے کہ دعوت مخاطب کے دل پر اثر انداز ہوجائے ورنہ دماغ اکثر مضبوط دلائل کو بھی مسترد کردیتا ہے لیکن دل اگر ایک بار مائل بہ اسلام ہوگیا تو دماغ کو بھی اس کی بات ماننی پڑتی ہے۔

علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ قبول اسلام کا تعلق جس قدر دل سے ہے دماغ سے نہیں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اسلام

کی کوئی ادا ہوتی ہے جو کسی کے دل کو بھا جاتی ہے پھر اسکی زندگی میں انقلاب آجاتا ہے علامہ اقبال نے تفصیل اس طرح بیان کی ہے ''قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہوجاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اسی تبدیلی کی تایید کے لئے وقف ہوجائے ،ہمیں اسلام کے قدیم اور جدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے قدیم مبلغوں کا وار غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا وہ اپنی للّٰہیت بے نفسی خوش خلقی اور احسان ومروت کے جادو اثر اداووں سے دلوں کو گرویدہ کر لیتے تھے اور اس طرح ہزار ہا لوگ ازخود بغیر کسی بحث وتکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے مگر جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔اس پر بحث وتکرار شروع ہوجاتی ہے اور ہدایت ختم ہوجاتی ہے۔مبلغین اسلام کو دلوں کو متاثر کرنے کے لئے نکلنا چاہئے یا دماغوں کو؟،ڈاکٹر اقبال نے مزید تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ اس کے فیصلہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں ،غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لئے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے،فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے آپ اسے بے اختیار کھا لیتے ہیں اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے نہیں پوچھتا کیا یہ کھانا طبی لحاظ سے مفید ہوگا ،آپ کہیں جارہے ہوں ، ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آتا ہے آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں ، وہیں ٹھنڈی ہوا کا اک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے اس وقت کوئی بھی شخص دماغ سے نہیں پوچھتا کہ مجھے سونا چاہئے یا نہیں ۔مختصر یہ کہ فطرت اسی طرح ہر کام میں دلوں کو گرویدہ کر کے اپنا مطلب نکالتی ہے وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی ۔اس لئے مبلغین اسلام کو چاہئے کہ اخلاق ومحبت کی گیرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے اس لئے ضروری ہے کہ مبلغین اسلام اسلامی کیریکٹر کی عظمت سے واقف ہوں تا کہ سرکش قسم کے لوگ بھی اپنی گردن جھکا دیں''۔

علامہ اقبال کا نقطہ نظر قابل غور ہے یہ ان ہی کا مصرعہ ہے ''جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ'' اسلامی اخلاق سے اور خدمت خلق کے کاموں سے اور اپنی روحانیت سے دلوں کو نرم کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لٹریچر اور عقلی دلیلیں بے مصرف ہیں لیکن دونوں طریقوں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ہماری تاریخ میں عبرت کے سبق آموز واقعات موجود ہیں تاتاریوں نے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی لاکھوں مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا لیکن یہی تاتاری قوم بعد میں چند درویشان باصفا کے ہاتھ پر مسلمان ہوگئی تھی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانہ سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

نئی نسل کا مستقبل تابناک کس طرح ہوسکتا ہے؟

مفتی امانت علی قاسمی
استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

ملک کا موجودہ منظر نامہ کسی باشعور شہری سے مخفی نہیں ہے ، چند دنوں قبل نئی تعلیمی پالیسی کا خاکہ منظر عام پر آچکا ہے، اس کے اثرات کیا ہوں گے اور مسلم بچوں کے عقیدہ وایمان کے ساتھ ان کے مستقبل کو کیا خطرات لاحق ہوسکتے ہیں اس پر گفتگو ہورہی ہے ۔تعلیم ایک ایسا راستہ اور طریقہ عمل ہے جس کے ذریعہ قوموں کے افکار ونظریات کو تبدیل کیا جاسکتا ہے، ماضی میں بھی انگریزوں نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اسی تعلیمی ہتھیار کا استعمال کیا تھا۔

نئی تعلیمی پالیسی میں ویدانتا کے جن اصولوں کو نافذ کرنے کی بات کہی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بلا کسی قانون کے ہی یکساں سول کوڈ کے منصوبے کی تکمیل کرلے گی اور یکساں سول کوڈ صرف ایک سیاسی پینترہ رہ جائے گا۔اس لیے کہ اس میں زبان، تہذیب اور لباس ہر طرح کی یکسانیت کی بات کہی گئی ہے ،اور ہر بچے کو لازمی اسکولی تعلیم کے ذریعہ اس کے فکر و تہذیب اور عقیدہ وعمل پر شب خون مارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان حالات میں مسلم بچوں کا مستقبل یقیناً خطرات کی زد میں ہے اور یہ ایک طویل منصوبہ ہے جسے روبعمل لانے کی پوری کوشش ہورہی ہے ۔عصری تعلیمی نظام کس حد تک مہلک ہے اور ایمان وعقائد کو کس حد تک متأثر کرتے ہیں اس سلسلے میں مولانا گیلانیؒ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں ۔مولانا گیلانیؒ ایک طویل تعلیمی تجربہ رکھتے تھے ، عصری اور دینی دونوں اداروں سے وابستہ تھے، اور علم وادب کے میدان میں بلند پایہ ہونے کے ساتھ قوت استدلال اور نتیجہ اخذ کرنے کے سلسلے میں ان کو کمال حاصل تھا، ہندوستان کے نظام تعلیم وتربیت پر ان کی دو جلدوں میں ضخیم کتاب ہے۔مولانا گیلانیؒ عصری تعلیمی اداروں کے نقصانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے برخاست ہوجانے کے بعد حکومت مسلطہ نے تعلیم کا جو نظام ملک میں (اسکولوں اور کالجوں غیرہ کے نام سے قائم کیا مشاہدہ بتارہا ہے کہ اس نظام کی تعلیم سے استفادہ کرنے والے مسلمانوں میں بتدریج اسلامی زندگی سے بُعد پیدا ہوتا چلا جارہا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جن خاندانوں میں جدید تعلیم تیسری اور چوتھی پشت میں اس وقت تک پہنچ چکی ہے ان میں اسلام کا صرف نام رہ گیا ہے، عام ابتدائی باتیں بھی ان لوگوں کو اسلام کی معلوم نہیں، یہ سنی ہوئی نہیں دیکھی ہوئی بات ہے کہ اچھے لکھے پڑھے لوگ جن کا نام بھی مسلمان کا سا تھا لیکن وہ اپنے پیغمبر ﷺ کی شخصیت تک سے ناواقف نظر آئے ظاہر ہے کہ اپنے دین سے جو اس حد تک دور ہوچکا ہو وہ دین کی دوسری باتوں سے کس حد تک واقف رہ سکتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ جیسے جیسے دن گزرتے جاتے ہیں اس قوم کے نام نہاد مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی چلی جارہی ہے اور حالات میں کوئی تغیر اگر خدانخواستہ

واقع نہ ہوتو یوں ہی یہ تعداد اور بڑھتی چلی جائے گی۔

(۲) حکومت کا میلان عموماً تعلیم کے لزوم کی طرف بڑھتا چلا جارہا ہے اس وقت تک تو تعلیم کے دائرے کو وسیع ہی کرنے پر حکومت قناعت کررہی ہے لیکن وہ دن دور نہیں ہے کہ ملک کے ہر باشندے کو مجبور کیا جائے گا کہ حکومت کے منظورہ نصاب کی تعلیم لزوماً اپنے بچے اور بچیوں کو دلائے جس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ عام مسلمانوں کو تھوڑا سا تعلق اسلام سے ابھی جو باقی ہے، تعلیم کی وسعت اور اس کا لزوم اس تعلق کو بھی کمزور کرتا چلا جائے گا، تعلیم یافتہ طبقہ سے مایوس ہوکر علماء اسلام جن عام مسلمانوں کی دینی عقیدت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں اس عقیدت کی عمر بھی زیادہ دراز نظر نہیں آتی۔

(۳) مذہب کے خلاف ہر زمانہ میں مختلف تحریکیں مختلف بھیسوں میں رونما ہوتی رہی ہیں ان تحریکوں کا مقابلہ ہر زمانہ کے علماء نے ان تحریکوں کی گہرائیوں تک خود پہونچنے کے بعد کیا ہے اور ہے بھی یہی بات کہ مرض کا علاج مرض کے صحیح واقفیت کے بعد ہی ممکن ہے؛ لیکن مرض کو مرض جیسی ناپاک چیز قرار دے کر اگر طبیب اس کے جاننے سے گریز کرلے گا تو مریضوں کا علاج ہو چکا۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ۲/۴۰۱)

مولانا گیلانی کی باتوں کو بار بار غور سے پڑھیے، آج سے قریب ستر سال پہلے آزاد ہندوستان کے نظام تعلیم کے ابتدائی ڈھانچے سے ہی انہوں نے ان خطرات کا ادارک کرلیا تھا، کہ ہر شخص اور ہر شہری کے لیے سرکاری تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے گا اور بالآخر ۲۰۰۹ء میں یہ قانون بن ہی گیا کہ ہر بچے کو سرکاری تعلیم حاصل کرنا ضروری ہوگا، اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس طرح مسلم بچوں کا ایمان اور اس کا مستقل خطرات کی زد میں ہے۔

ایسے حالات میں کس طرح کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے کہ مسلم بچوں کا مستقبل تابناک ہو، عصری تعلیمی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی جاسکے، تعلیم کے نام پر بھگوا کرن کرنے اور ہر ہندوستانی کو ایک رنگ میں رنگ کر مسلمانوں کو اسلامی تہذیب وثقافت سے دور کرنے کی جو کوشش کی جارہی ہے اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے اور کس طرح اسلامی ثقافت کا فروغ اور تحفظ کیا جاسکے؟ اس سلسلے میں چند باتیں قابل توجہ ہیں ان پر عمل کرکے ممکن ہے کہ کسی حد تک نئی نسل کے تابناک مستقبل کا خواب تعمیر کیا جاسکے۔

(۱) اسکول میں تعلیم پانے والے ہر بچے کے لیے دینیات کے نظام کو یقینی بنایا جائے، اور کوشش کی جائے کہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والا خاص کر انگلش میڈیم اسکول میں تعلیم پانے والا ہر بچہ مکتب کے نظام سے جڑے اور تین چار سال صرف ایک گھنٹے کے ذریعہ ان بچوں کو اسلام کے لازمی عقائد کی تعلیم دے دی جائے، عبادات کی اہمیت، ایمان کی عظمت، کفر وشرک کی قباحت اور اس سے نفرت ان کے دلوں میں جاگزیں کردیا جائے، اسلامی تاریخ کے روشن عنوانات سے ان کو واقف کرایا جائے، حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگی کے مختصر حالات، آپ ﷺ کی زندگی کے اہم پہلو، سلاطین ہند کے مختصر واقعات اور اسلامی تہذیب کی ضرورت و اہمیت جیسے عنوانات سے متعارف کرا کر ان کے دل کی سادہ تختی کو ان چیزوں سے اس طرح پُر کردیا جائے کہ دنیا کی کسی غلیظ اور مکروہ تربیت کے لیے ان بچوں کے لوح دل پر کوئی جگہ باقی نہ رہے۔

(۲) اسکول میں تعلیم پانے والے بڑے بچے، اسی طرح کالج میں تعلیم حاصل کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کے لیے مختصر اسلامیات کا کورس مرتب کیا جائے اور یہ بچے جہاں ٹیوشن پڑھتے ہیں وہیں پر یا کہیں اور مناسب جگہ حاصل کرکے اتوار کو ایک کلاس اسلامیات کی کرائی جائے جن میں اسلام کی اہم تعلیمات اسلام کے بنیادی عقائد، نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے جملہ مسائل، اسی طرح نکاح وطلاق، وقف، معاملات، اخلاقیات، میراث وغیرہ مسائل کی اجمالی اور ضروری تعلیم دی جائے۔ ایک سال پر یہ کورس محیط ہو جس میں سبق کی طرح بچوں کو پڑھایا جائے جلسے کی طرح بیانات نہ کرائے جائیں، اور سال میں اس کا ایک امتحان لے کر مختصر اسلامیات کورس کا

ان کو سرٹیفکٹ دیا جائے اس سے مسلم بچوں میں اسلام کے ضروری تعلیمات سے واقفیت ہوگی ، اور اسلام کے تئیں ان میں بیداری پیدا ہوگی۔ دیکھنے میں آتا ہے کہ مدارس کے فضلاء طلاق کے باب میں غلطی نہیں کرتے ہیں لیکن اسکول وکالج کے تعلیم یافتہ حضرات طلاق کے نظام سے ناواقف ہونے کی وجہ سے عموماً غلطی کرتے ہیں۔

(۳) جہاں پر مسلمان معاشی اعتبار سے مستحکم ہیں وہاں پر پوری کوشش ہونی چاہیے کہ سرکار کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے انگلش میڈیم اسکول قائم کئے جائیں او رشہر میں موجود معیاری ادارے سے زیادہ بہتر معیاری اسکول قائم کیا جائے تا کہ ہمارے اسکول، ماڈل اسکول بن سکیں۔اس کے ذریعہ ہم اپنی نسل کے ذہنوں کو بدلنے والے منصوبوں کے خلاف آسانی سے کام کر سکتے ہیں، اپنی تہذیب وثقافت کا تحفظ کر سکتے ہیں اور بچوں کے دل ودماغ کو مغربی افکار کی یلغار سے بچا سکتے ہیں آزادی کے نام پر اباحیت کے جس دلدل میں دھکیلنے کی سازش کی جارہی ہے اس کے ذریعہ ہم اس کا تدارک کر سکتے ہیں۔اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے، اس لیے کہ منصوبہ بند طریقہ پر بچیوں کو ان کے ایمان سے بے دخل کرنے کی کوششیں ہورہی ہیں، کوشش کی جائے کہ لڑکیوں کے لیے مسلم ادارے ترجیحی طور پر قائم کئے جائیں اور جہاں ایسا ممکن نہیں ہے وہاں بچیوں کے والدین کو بیدار ہوکر اپنے بچیوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دینا چاہیے۔

(۴) چار ستمبر کو مولانا امین عثمانیؒ کی ایک آن لائن تعزیتی نشست میں شریک ہوا تھا، مولانا کی زندگی پر بہت سے حضرات اہل علم نے روشنی ڈالی ان کی خوبیوں میں ایک اہم خوبی کا تذکرہ مختلف حضرات نے کیا کہ مولانا امین عثمانی نئی نسل کی تربیت کا کام کیا کرتے تھے، مولانا امین عثمانی چوں کہ مولانا قاضی مجاہدالاسلامؒ کے تربیت یافتہ تھے، اور مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی خاص بات یہ تھی کہ وہ رجال ساز اور افراد ساز تھے، افراد سازی پر ان کی خاص توجہ تھی، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس اس میدان میں کمی آگئی ہے، تعلیم کے زمانے میں اساتذہ بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور اسی تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے فضلاء زندگی کے ہر میدان میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور مادیت کے اس طوفانی اور سیلابی دور میں بھی فضلاء مدارس صلے اور انعام سے بے پرواہ اور معاشی زندگی سے بے نیاز رہ کر دین کی خدمات میں مصرف رہتے ہیں لیکن ایام تعلیم کے بعد جب ہمارے فضلاء کسی میدان میں کام پر لگ جاتے ہیں تو اس زمانے میں بھی ان کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے یہ زمانہ ان کے شعور وادارک اور احساس وذمہ داری کا زمانہ ہوتا ہے، اس زمانہ میں تربیت اور افراد سازی سے پتھر کو پارس اور سیپ کو موتی بنایا جاسکتا ہے، اوپر جن حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے یہ وہ لوگ تھے جو فضلاء مدارس کو ان کی صلاحیت کے لحاظ سے کام پر لگایا کرتے تھے، ان کی تربیت اور حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو معاشی یا علمی طرح سے مدد کیا کرتے تھے میں یہ سمجھتا ہوں اس میدان میں وسیع پیمانہ پر کام کرنے کی ضرورت ہے تا کہ قوم کو ان کی ضرورت کے مطابق کام کے افراد مہیا کرائے جاسکیں۔اس سلسلے میں بڑے تعلیمی اداروں کو بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے ہمارے جو فضلاء میدان عمل میں مصروف ہیں ان کے احوال کا جائزہ لیا جائے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کو کام کے مناسب مواقع مہیا کئے جائیں اس وقت جس رفتار کے ساتھ ہمارے مدارس سے افراد فارغ ہورہے ہیں ان کو اس تناسب سے کام کی جگہیں نہیں مل رہی ہیں جس کی وجہ سے بہت سے ہمارے قیمتی جوہر ضائع ہوجاتے ہیں جب کہ یہ وہ افراد ہیں جن پر قوم کے ہزاروں روپیے اور بڑے استاذہ کی دوررس تربیت کا حصہ لگا تھا دس یا بارہ سال ہم نے ان پر محنت کی تھی ان کا ضائع ہوجانا میں سمجھتا ہوں اپنی محنت کا ضائع ہونا ہے ان پر نظر نہ رکھنا اپنے ہی کام سے صرف نظر کرنا ہے۔فکر کے نہاں خانے میں یہ باتیں گردش کررہی تھیں اسے صفحات پر منتقل کر کے آپ کے سامنے پیش کیا ہے اس امید کے ساتھ اگر ان پر توجہ دی گئی تو وہ دن دور نہیں کہ نئی نسل کا مستقبل تابناک ہوگا۔

☆☆☆

❑ گوشۂ ادب

قسط : ۲

ماہر القادریؒ کی نعتیہ شاعری کا منفرد بیانیہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

ماہر صاحب نے بہت سی نعتیں خاص موضوعات پر کہی ہیں جیسے ''اسیران بدر''، ''ظہور قدسی''، ''حریت کاملہ کا مبلغ اعظمؐ''، ''انقلاب''، ''معراج کی رات''، ''ساقی نامہ''، ''صبح سعادت''، ''جانوروں سے حسن سلوک'' وغیرہ، ماہر صاحب کی یہ نعتیں ہوں یا دیگر سب کا بیانیہ سیرت کے گوشوں کو اجاگر کرتا ہے، عمل کی تلقین کرتا ہے، سوز و گداز اور لہجہ کی رعنائی سب کا خاصہ ہے، آنحضرتؐ سے تعلق کا اظہار اور آپؐ کی ذات سراپا صفات سے تعلق پیدا کرنے اور محبت رسولؐ کی جوت جگانے میں ماہر صاحب کا جواب نہیں، فرماتے ہیں ؎

مبارک اہل دنیا کو زر دولت کی ارزانی
مگر ماہرؔ کو بس کافی ترا اک نام ہے ساقی

اے نام محمد صلی علی ماہرؔ کے لیے تو سب کچھ ہے
ہونٹوں پہ تبسم بھی آیا، آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے

وہی حاصل ہے، ماہرؔ میری ساری زندگانی کا
وہ اک لمحہ کہ جو یادِ محمد میں گزارا ہے

تم رتبۂ ماہرؔ سے خبر دار نہیں ہو
من جملۂ خدامِ رسولِ عربی ہے

اور اس شعر کی زبان اور بیان کی خوبصورتی دیکھیے اور داد دیجئے ؎

خشک آنکھوں مبارک ہو یہ طغیانی شوق
ہیں رواں اشک بہ اندازِ دگر کیا کہنا

بطورِ خاص یہ شعر پڑھیے اور لطف لیجئے، دیکھئے کہ سادہ سے الفاظ میں ماہر صاحب کیا کہہ گئے ؎

مرحبا الفتِ سردارِ دوعالم کے طفیل
آن پہنچا ہوں کہاں کشف و کرامت کے بغیر

الفاظ کے خوبصورت پیرہن میں بلیغ معانی، شریعت محمدیؐ کی ابدیت وحقانیت کی یہ بے لاگ وضاحت بھی ملاحظہ کیجئے ؎

زندگی کچھ بھی نہیں تیری محبت کے بغیر
اور بے روح محبت ہے اطاعت کے بغیر
کوئی دستور مکمل نہ کوئی نظم درست
تیرے لائے ہوئے آئینِ شریعت کے بغیر

ماہر صاحب بہت وضاحت کے ساتھ یہ اعلان کرتے ہیں آج بھی دنیا کی ترقی اور دنیا میں امن وسکون کے قیام لیے سیرت کے اسی نور اور ان ہی جلوؤں سے روشنی حاصل

کرنے کی ضرورت ہے جس نے پہلے بھی اس دنیا کو منور کیا ہے ۔

اس کے جلوؤں کی ضرورت آج بھی دنیا کو ہے
جو زمانے میں اجالا ہر طرف پھیلا گیا
بدر کے میداں میں خود آ کر وہ روحِ کائنات
ہم مسلمانوں کو رازِ زندگی سمجھا گیا

تونے فرمایا کہ ہیں یہ طور فتحِ زیست کے
تونے سمجھایا کہ یوں ہوتی ہیں قومیں کامیاب

ماہر صاحب صاحبِ امت کے حال پر بے چین ہوتے ہیں تو نگاہِ کرم کی التجا بھی کر بیٹھتے ہیں، امت کی بے عملی، بدحالی وتنزلی کو بھی اپنی نعتوں میں پیش کرتے ہیں، مثلاً فرماتے ہیں ۔

اے حامیٔ بیکس! ختمِ رسل! یہ حال ہے تیری امت کا
دنیا میں کسی کی بھی ہو خطا الزام ہمیں پر آتے ہیں

یہ وہ نعت ہے جو ایک مشاعرے میں ماہر صاحب نے فی البدیہہ سنائی تھی، اس کا یہ شعر دیکھئے جس میں شاعر نے نبیؐ کی رسالت کی آفاقیت و علمیت کو پیش کیا ہے، قل یا أیها الناس إني رسول الله الیکم جمیعا کے مفہوم کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے ۔

تاروں سے یہ کہہ دو کوچ کریں خورشید منور آتے ہیں
قوموں کے پیمبرؑ آ تو چکے اب سب کے پیمبرؐ آتے ہیں

تڑپ وسوز اور شکایت کا یہ انداز بھی ملاحظہ ہو ۔

نام لیوا ہیں ترے پامالِ صد رنج و محن
یک نظر یا رحمۃ للعالمین بر ما فگن

آپ کی امت ہے با حالِ تباہ
اس طرف بھی اک عنایت کی نگاہ

یہ دو شعر بھی دیکھئے، اشارہ عقیدۂ ختم نبوت کی طرف کرتے ہیں مگر نعت میں سیرت کو اور سیرت سے بھی گھریلو زندگی کے پہلو کو کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ۔

مقصود جہاں، محبوبِ خدا، اور اس پہ یہ شانِ فقر وغنا
کپڑے بھی وہ خود دھو لیتے ہیں فاقوں کی بھی عادت ہوتی ہے
"اتممت علیکم" فرما کر اللہ نے خود اعلان کیا
اتمامِ کرم اب ہو تو چکا، بس ختم نبوت ہوتی ہے

ایک نعت کا عنوان ہے "سیرتِ رحمتِ عالم" جو صرف ۶/ اشعار پر مشتمل ہے لیکن اس کا بیانیہ اور اس کی جامعیت واقعی سیرت کو اجمالی طور پر بیان کرنے میں لاجواب ہے، اس کا معنی خیز مطلع دیکھئے جس میں ماہر صاحب نے محبت و عقیدت کے حدود اور شریعت کی پاسداری و بالادستی کی طرف اشارہ کیا ہے ۔

کس بیم ورجا کے عالم میں طیبہ کی زیارت ہوتی ہے
اک سمت شریعت ہوتی ہے ایک سمت محبت ہوتی ہے

اس میں شاعر نے سیرت وسنت رسول کی حجیت پر گفتگو کی ہے اس نعت کے یہ دو انتہائی جامع شعر ملاحظہ کیجئے ۔

اے صلی علی! ایک ایک ادا اللہ کی آیت ہوتی ہے
ہے روئے محمدؐ پیشِ نظر قرآں کی تلاوت ہوتی ہے
جو بات وہ فرما دیتے ہیں معیارِ صداقت ہوتی ہے
دستورِ عمل بن جاتی ہے اور دین میں حجت ہوتی ہے

کیف وسرور اور جذب ومستی میں ڈوبا ہوا یہ شعر بھی دیکھئے اور اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے صحابہ کرام کی وہ تاریخ بھی سامنے رکھیے جو ان کی بے مثال قربانیوں پر مشتمل ہے، محبت کی یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر انسان ہر غم کو بخوشی قبول کرتا ہے، جان نچھاور کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے، زخم کھاتا ہے اور مسکراتا ہے، انگاروں پہ چلتا ہے مگر احساس پھولوں پہ چلنے کا ہوتا ہے، پاؤں کے چھالے اور دلوں کے نالے، آہ وشیون

سے تسکین قلب کا سامان ہوجاتے ہیں، صحابہ نے یہ کر کے دکھایا، اور نبی کے نام لیوا ہر زمانے میں یہ کرتے رہے ہیں، یہ خوبصورت شعر دیکھیے جو صرف شاعرانہ خیال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک روشن وطویل تاریخ ہے ۔

طیبہ کے ببولوں کے کانٹے پھولوں سے بھی نازک تر نکلے
تلووں کو بھی لذت ملتی ہے، آسودہ طبیعت ہوتی ہے

ماہر صاحب کی ایک نعت کا عنوان ہے ''صبحِ سعادت''، یہ ان کی مشہور ترین بلکہ زباں زد عام نعتوں میں سے ہے، اس نعت کو جب بھی سنیے یا پڑھیے دل کی دنیا میں ہلچل ہوتی ہے، جذبات کے تاروں میں حرکت ہوتی ہے، ذوق و وجدان کو تازگی و زندگی ملتی ہے، اس نعت کی نغمگیت، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، تراکیب کی برجستگی اور معانی کی روانی وارزانی نے اسے شاہکار بنادیا ہے، یہ ایسی مرصع نعت ہے کہ جب بھی پڑھیے تو نئی کیفیت ملتی ہے، ماہر صاحب نے اس نعت میں بعثت نبوی سے قبل کی انتہائی مہیب وخطرناک تاریخ، اور ظلم و جور اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو تین مصرعوں میں بیان کر کے چوتھے مصرع میں بعثت کا ذکر کیا ہے ۔

کچھ کفر نے فتنے پھیلائے، کچھ ظلم نے شعلے بھڑکائے
سینوں میں عداوت جاگ اٹھی، انسان سے انساں ٹکرائے
پامال کیا برباد کیا کمزور کو طاقت والوں نے
جب ظلم وستم حد سے گذرے تشریف محمدؐ لے آئے

اس کے بعد پھر اپنے مخصوص لب و لہجے میں انسانیت پر بعثت محمدی کے احسانات کا ذکر کیا ہے، ایک ایک مصرع میں سیرت نبوی کے ایک ایک باب کو سمیٹا ہے، تاریخ کے ایک ایک باب کو ایک شعر میں بیان کردیا ہے اور انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اندرون میں ہلچل پیدا ہوجائے اور کچھ کر گزرنے کا شوق جاگ جائے، یہ نعت اپنے ادبی رنگ وآہنگ کے اعتبار سے بھی اوج کمال پر ہے ۔

رحمت کی گھٹائیں لہرائیں، دنیا کی امیدیں بر آئیں
اکرام و عطا کی بارش کی، اخلاق کے موتی برسائے
تہذیب کی شمعیں روشن کیں اونٹوں کو چرانے والوں نے
کانٹوں کو گلوں کی قسمت دی، ذروں کے مقدر چمکائے

اور یہ شعر دیکھیے کہ نبیؐ اس امت کو کیا کیا دے کر گئے اور کیسے کیسے راز سمجھائے، ان اشعار کی معنویت پر غور کیجئے اور سر دھنیے ۔

کچھ کیف دیا کچھ ہشیاری، کچھ سوز دیا کچھ ساز دیا
میخانۂ علم و عرفاں میں توحید کے ساغر چھلکائے
ہر چیز کو رعنائی دے کر دنیا کو حیاتِ نو بخشی
صبحوں کے بھی چہروں کو دھویا راتوں کے بھی گیسو سلجھائے

اور رسول جس مقصد سے تشریف لائے اور آپ کا جو سب سے بڑا کارنامہ ہے اس کو کچھ اس انداز سے نظم کیا ہے ۔

اللہ سے رشتے کو جوڑا، باطل کے طلسموں کو توڑا
خود وقت کے دھارے کو موڑا، طوفاں میں سفینے تیرائے

سیرت محمدی کی جامعیت، دین کا کامل تصور ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ کی تشریح، اور اسلام کی مکمل تاریخ کے ساتھ جنگ وامن، موت وحیات، شہادت وآخرت اور قرآن کا نظام زندگی سامنے رکھیے اور اس جامع شعر کی تشریح کرنے اور اس کا مصداق بننے کی کوشش کیجئے سوچیے کہ محمد رسول اللہؐ کیسا جامع دین لے کر آئے، جس دین میں توازن تھا، اعتدال تھا، جس میں ہر شے کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا تھا، امت جب تک دین کے کامل تصور کو سینے سے لگائے رہی اور شریعت محمدیؐ کے اس توازن کو قائم رکھا تب تک سربلند رہی، جب بھی دین

کے کسی پہلو اور کسی جزء کو متروک کیا گیا اس سے پہلو تہی کی گئی تو رسوائی ومغلوبیت مقدر بن گئی، تو میں اس پر اس طرح ٹوٹ پڑیں جیسے بھوکے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں، ماہر صاحب فرماتے ہیں ؎

تلوار بھی دی، قرآں بھی دیا، دنیا بھی عطا کی، عقبیٰ بھی دیا
مرنے کو شہادت فرمایا، جینے کے طریقے سمجھائے

آگے مزید بعثت محمدی کے احسانات اور سیرت محمدی کے تابناک پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں ؎

مظلوموں کی فریاد سنی، مجبوروں کی غمخواری کی
زخموں پہ خنک مرہم رکھے، بے چین دلوں کے کام آئے

اور اس شعر کی معنویت، وسعت اور زبان وبیان کی داد دیے بغیر کون رہ سکتا ہے ؎

عورت کو حیا کی چادر دی، غیرت کا غازہ بھی بخشا
شیشوں میں نزاکت پیدا کی، کردار کے جوہر بھی چمکائے

کمال دیکھیے کہ ایک ہی شعر میں واقعہ معراج اور معجزہ شق القمر کا تذکرہ کرکے گذر گئے ؎

مکہ کی زمیں اور عرش کہاں، دم بھر میں یہاں پل بھر میں وہاں
پتھر کو عطا گویائی کی، اور چاند کے ٹکڑے فرمائے

واللہ متم نورہ ولوکرہ الکافرون اور لیظھرہ علی الدین کلہ ولوکرہ المشرکون کا مفہوم کس لطافت کے ساتھ نظم کیا ہے، ملاحظہ کیجئے ؎

توحید کا دھارا رک نہ سکا، اسلام کا پرچم جھک نہ سکا
کفار بہت کچھ جھنجھلائے شیطاں نے ہزاروں بل کھائے

یہاں ہم کچھ اور نعتوں کا تذکرہ کریں گے مگر صرف ان کے منتخب اشعار ذکر کرکے ان نعتوں میں بیان کیے گئے مضامین کا تذکرہ کردیں گے، ''ساقی نامہ''، ''پیغمبر انسانیت''، ''حریت کاملہ کا مبلغ اعظم'' اور ''انقلاب'' کے عناوین سے موسوم نعتوں کا تذکرہ کرکے ہم اس مضمون کو تمام کریں گے۔

آج آزادی انساں پر بڑی بحثیں ہوتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ انسان آج بھی انسانوں کی غلامی سے باہر نہیں نکل سکا، آج بھی غریب کو امیر کھا رہا ہے، سیکولرزم کے نام پر بدترین غلامی نے انسان کو جکڑ رکھا ہے، جبر واستبداد کی دلخراش داستانیں ہیں، انسان در در کی ٹھوکریں کھا رہا ہے، نظریاتی جنگ کے نتیجہ میں بے شمار انسان اپنی جانیں دے چکے ہیں، آزادی کا اگر صحیح تصور ہے تو وہ اسلام نے عطا کیا ہے، محمد عربیؐ کی آمد سے پہلے انسان حریت کے مفہوم سے واقف نہیں تھا، انسانی معاشرہ تباہیوں کا مرقع تھا، خباثتیں عام تھیں، دنیا کا نظام آج ہی کی طرح امیروں کے قبضے میں تھا، مالک حقیقی کی اطاعت چھوڑ کر انسان کل بھی در در کی جبہ سائی پر مجبور تھا اور آج بھی ہے، اقبال نے کہا تھا ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

آزادی کا صحیح مفہوم پیغمبر انسانیتؐ نے سمجھایا، آپؐ نے بتایا کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ انسان آزاد ہے کہ وہ اس کی کائنات میں غور کرے اور اس کو برتے، آپؐ نے اس بابت جو انقلاب برپا کیا اس نے سوچ بدل کر رکھ دی، خلیفۂ وقت کا راستہ روک کر ایک عورت سوال کرنے لگی، برسرِ منبر خلیفہ سے سوال کرنے کی آزادی حاصل ہوئی، رستم کے دربار میں ربعی بن عامر یوں گویا ہوئے کہ ''ہمیں اللہ نے انسانوں کو انسان کی غلامی سے نکال کر اللہ واحد کے در پر لانے کے لیے برپا کیا ہے''، مولانا ماہر القادریؒ نے ان تمام مفاہیم کو اپنی پرشکوہ اور جاذب و دلکش نعت میں منظوم پیش کیا ہے، ''حریت کاملہ کا مبلغ اعظم'' ۱۷/اشعار پر

مشتمل ہے، جس کا ہر شعر ایک سے بڑھ کر ایک ہے، ابتدائی تین شعر ملاحظہ کیجئے۔

ذلیل جذبات کی فضا میں ضمیر خوابیدہ ہو چکا تھا
دماغِ انساں کا ہر تخیل ہوس کی ظلمت میں گھر گیا تھا
بیاضِ اخلاق منتشر تھی، نظامِ حیات برہم
غریب تھے، ذلتِ سراپا، امیر تھے نخوت مجسم
جفا کے بادل گھرے ہوئے تھے، گھٹا غلامی کی چھا رہی تھی
ستم کی بجلی تڑپ تڑپ کر وفا کا خرمن جلا رہی تھی

اور یہ اشعار پڑھیے۔

یہ دیکھ کر گرمیٔ معاصی خدا کی غیرت کو جوش آیا
امنڈ اٹھے رحمتوں کے چشمے، ابل پڑے حریت کے دریا
فضا غلامی کی کانپ اٹھی اک انقلاب آ گیا جہاں میں
امارتوں کی بلندیوں نے جھکا ہی دیں خاک پر جبینیں
جھکی اخوت کے آستاں پر مداین و نینوا کی سطوت
اتر گیا چشمِ خود سری سے خمارِ صہبائے قیصریت
گزر گیا حریت کا طوفاں، غرور و نخوت کی چوٹیوں سے
ابھر کے پہنچیں بلندیوں پر غلام اقوام پستیوں سے

آخری تین شعر سے بھی محظوظ ہو لیجئے۔

ہوئی مساوات کی وہ بارش کہ بھر دیے جس نے دشت و صحرا
پہاڑ کے ہو گیا مقابل جہاں کا اک اک حقیر تنکا
بدل گئیں نغمۂ طرب سے ستم رسیدوں کی آہ و شیوں
کیے گئے عرصۂ جہاں میں اصول جمہوریتِ مدوّن
سلام اے حریت کے داعی سلام اے رحمت مجسم
سلام اے مرکز اخوت، سلام اے رحمت دوعالم

دنیا کے کسی بھی نظریہ کو اگر اساسِ زندگی بنایا جائے تو اس کی حیثیت عارضی ہوگی، انسانی نظریات کی بنیاد پر جتنے بھی انقلاب دنیا میں آئے وہ بلبلوں کی طرح سطح سمندر پر اٹھے اور پھر ناپید ہو گئے، ان کو انسانی زندگی کی اساس بنانا یقیناً خطرناک ہے، ماضی قریب و حال کا جائزہ لیجئے تو کمیونزم کے خونیں انقلاب نے لاکھوں انسانوں کی جانیں لی ہیں، پھر کیپٹلزم کے علمبردار امریکہ نے جھوٹ اور جور و ظلم کی ساری حدیں ہی پار کر دی ہیں، یہی نہیں کہ ان دونوں نظریات کے حاملین نے جن کو دشمن جانا ان کی زندگی جہنم بنا دی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا داخلی نظام بھی تہس نہس ہوا، ان کے معاشرے کی انارکی اس حد تک جا پہنچی کہ لوگ خودکشی پر مجبور ہونے لگے، تصنعات و تکلفات نے انسانی زندگی کو بوجھل بنا کر رکھ دیا، حقیقی انقلاب بس وہی تھا جو حضرت محمدؐ نے برپا کیا، جس کی تاریخ بڑی سنہری ہے، وہ آخری انقلاب تھا جس کے آنے سے انسانیت کی قسمت سنور گئی تھی، جس نے طاقتور و کمزور کے فرق کو مٹا دیا تھا، جس نے ظلم کا خاتمہ کر کے عدل قائم کیا تھا، جس نے امیر و مفلس کو ایک صف میں کھڑا کر دیا تھا، جس نے معاشرے کے محروموں کو خوشیاں عطا کی تھیں، ماہر صاحب کہتے ہیں۔

جہاں سے نقشِ خودی کے مٹا دیے تونے
چراغِ مجلسِ عرفاں جلا دیے تونے
جہاں کو درس دیا زندگیٔ سادہ کا
تکلفات کے پرزے اٹھا دیے تونے
تری نگاہ کے قرباں کہ مل گئی تسکیں
ترے نثار کہ روتے ہنسا دیے تونے

اس انقلاب کے فیض سے دنیا نے جو تبدیلیاں دیکھیں اور انسانیت کو جو فیض پہنچا اور کائنات میں امن و سکون کی جو فضا قائم ہوئی اور انسانیت اپنی تاریخ میں جس اوجِ کمال تک پہنچی اس کو ماہر صاحب نے ''پیغمبر انسانیت'' میں نظم

کیا ہے، وہ کہتے ہیں ۔

تیرے جلوؤں سے عبارت بزمِ ہستی کا چراغ
اے کہ تیرے دم سے وابستہ نظامِ کائنات
تیرے صدقے تونے کی تنظیمِ بزمِ زندگی
تیرے قرباں تونے دی ترتیبِ اجزائے حیات

مزید وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں ۔

تیری شوکت کا نچھاور شانِ بغداد و دمشق
تیری عظمت کا تصدُّق عظمتِ مصر و ہرات
کفر کی ظلمت کو فانوسِ تجلّا کردیا
آدمیت کا جہاں میں بول بالا کردیا

اوراس شعر کی معنویت وادبیت پرغور کیجئے ۔

تونے سوکھی پتیوں میں پھونک دی روحِ حیات
تونے ذروں کو بنایا روکشِ صد آفتاب

اور یہ رنگ بھی اسی نعت میں ملاحظہ کیجئے ۔

تیرے فیضِ تربیت کا عکس ہے عزمِ حسین
زندگی کا تیری اک پہلو ہے فقیر بوتراب
وحشیوں کو واقفِ تہذیبِ فطرت کردیا
بارک اللہ تونے کانٹوں کو بنا ڈالا گلاب
تونے رنگِ جہل کو فانوسِ عرفاں کردیا
تونے بخشی چہرۂ انسانیت کو آب و تاب

ماہر صاحب کی نعت ''ساقی نامہ'' پڑھیے تو عجیب سماں بندھ جاتا ہے، اس نعت کے ''دوراول'' میں ۱۶/اشعار ہیں اور ''دورثانی'' میں ۱۲/اشعار ہیں، پہلے دور کی ابتدا وہ رسالت پر ایمان اور نبیؐ کی الفت سے کرتے ہیں، پھر نبی کے حضور امت کی زبوں حالی، دل کی ویرانی، ایمان سے دوری، عمل سے بیگانگی، فکری ونظریاتی بے راہ روی کو بحاجت کے ساتھ یہ انداز شکایت پیش کرتے ہیں، فرماتے ہیں ۔

زمانے کا رسالت پر تری ایمان ہے ساقیؐ
مگر الفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقیؐ
تیرے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقیؐ

پھر آگے چل کر کہتے ہیں ۔

وہ ایمان کی گرمی، نہ وہ تنظیم امت
نہ مصر و شام پہلے سے، نہ وہ ایران ہے ساقیؐ
میری آنکھوں نے دیکھی ہے عجم کی بزم آرائی
غضب ہے محفلِ بغداد بھی ویران ہے ساقی

غور کیجئے اس معنی خیز شعر پر جو نظریاتی انتشار پر بھی چوٹ کرتا ہے ۔

نگاہِ و ول پہ قبضہ کرلیا ہے علمِ حاضر نے
کوئی منکر، کوئی باغی، کوئی حیران ہے ساقیؐ

اورملاحظہ کیجئے ۔

جہاں میں انتشار و برہمی کا دور دورہ ہے
ادھر طغیان ہے ساقی، ادھو طوفان ہے ساقیؐ
خداوندان دولت کی خدائی آہ! کیا کہیے
کوئی فرعون ہے ساقی کوئی ہامان ہے ساقیؐ
مسلماں نامسلمانوں کی صف میں آئے جاتے ہیں
کہ اب ایمان اک ٹوٹا ہوا پیمان ہے ساقیؐ
مرا مسلک نہیں ایمان کو ڈر کر چھپا لینا
مرا یمان تو اعلان ہی اعلان ہے ساقیؐ

پھر دوسرے دور میں خود ہی یوں گویا ہوتے ہیں ۔

تیری آواز حق کا آخری پیغام ہے ساقیؐ
کہ تیری ذات پر ہی دین کا اتمام ہے ساقیؐ
تیرے دورِ رسالت کا یقین ہو نہیں سکتا

ازل آغاز ہے ساقیؔ ابد انجام ہے ساقیؔ
حنین و بدر و خیبر میں وہ تیری رزم آرائی
جہانِ کفر اب تک لرزہ بر اندام ہے ساقیؔ

اگر چہ ہم لوگ ماضی کی داستانیں سنانے اور اس پر لفاظی کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، اپنا کل سرمایہ ہی اپنے ماضی پر فخر کو سمجھتے ہیں مگر ماہر صاحب نے آخری شعر میں جو بات کہی وہ یوں ہی نہیں کہی ہے، موجودہ دنیا کا یہ خدشہ اب راز نہیں رہا کہ ان کا مقابلہ اگر کوئی کرسکتا ہے تو صرف وہی قوم جس نے ماضی میں فتوحات کی تاریخ رقم کی ہے، سوویت یونین نے بھی اس قوم کو ہدف بنایا تھا اور پھر جب کیپٹلزم نے کمیونزم کا جنازہ اٹھایا تو باقاعدہ اسلام کو اپنا دشمن قرار دیا، پھر اسے زیر کرنے کے لیے تگ و دو شروع کی، پہلے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر اپنا غلام بنایا، پھر فکری و سیاسی طور پر حاوی ہوئے اور بالآخر عسکری طور پر بھی ملکوں کے ملک تباہ کردینے کا مشاہدہ کرایا، جب عرب بہاریہ کا دور شروع ہوا، زمانے نے کروٹ لی، انقلاب کی دستک ہوئی، تو دشمن نے بڑی چابک دستی سے اپنے عرب غلاموں کے ذریعہ اسے ناکام کیا، پھر ان تمام اشخاص و تحریکات کو دہشت گرد قرار دلوایا جو اسلامی نظام کے حامی و داعی و علمبردار تھے، کیونکہ اسلام دشمنوں کو اس حقیقت کا ادراک ہے کہ قرآن کے علمبردار بحیثیت مجموعی کبھی بھی نظریاتی شکست کو قبول نہیں کریں گے، ماہر صاحب کو دیکھیے ایک طرف سوال کرتے ہیں، پھر حوصلہ دیتے ہیں اور بھرپور اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں ؎

مسلمانوں کی وہ اقبال مندی کیا ہوئی آخر
وہی قرآن ہے ساقیؔ وہی اسلام ہے ساقیؔ
زمانہ آ گیا تہذیبِ افرنگی کے پھندوں میں
کہ ہم رنگِ زمیں پھیلا ہوا اک دام ہے ساقیؔ
مگر اس پر بھی باطل حق پہ غالب آ نہیں سکتا
خدا کے دشمنوں کا خیالِ خام ہے ساقیؔ

یہ تھیں قادرالکلام، صاحبِ زبان و صاحبِ علم نعت گو شاعر مرحوم و مغفور جناب ماہر القادری کے نعتیہ کلام کی رعنائیاں اور ان کی نعتوں کے بافیض و موثر و منفرد بیانیہ کی کچھ جھلکیاں، ان کی نعتوں میں اظہارِ عقیدت و محبت بھی ہے، بیانِ عظمت رسول بھی، وہ پیغام رسانی سے بھی نعتوں کو سجاتے ہیں اور منصب نبوت کے مقاصد و فرائض کو بھی نظم کرتے ہیں، جذب و کیف و مستی میں ڈوب کر بھی شعر کہتے ہیں اور علم و ادب کے موتی بھی لٹاتے ہیں، قسمتیں سنوارنے کا مواد بھی فراہم کرتے ہیں اور جذبات و شوق کو بھی مہمیز کرتے ہیں، اطاعت رسول کی دعوت بھی دیتے ہیں اور اس سے رشتہ ٹوٹنے کے سبب زوال کی کہانی بھی سناتے ہیں، اظہارِ حسرت و افسوس بھی کرتے ہیں مگر ساتھ ہی حوصلہ بھی دیتے ہیں، پُر اعتماد لہجے میں بڑھ کر دامنِ رسول تھامنے اور اسی کے سایے میں دنیا کو زیر کرنے کی بھی دعوت دیتے ہیں، پیامِ رسالت کی ترسیل، جذبات کی فراوانی، اظہارِ تعلق، سوز دروں، غمِ حیات اور امت کے حال پر تڑپنے اور آنسو بہانے کے ساتھ محبت و وارفتگی سے بھرپور شاعری واقعی ان کی قلبی کیفیت ذات نبیؐ سے تعلق، سیرت نبیؐ سے گہری واقفیت اور شریعتِ محمدی کی قیادت و بالادستی پر یقین کامل کا پتہ دیتی ہے، وہ خود ہی کہہ گئے ہیں ؎

نعت گوئی میرا منصب ہے نہ میں حسان ہوں
میرے آنسو شعر بن جائیں تو پھر میں کیا کروں

☆☆☆

❑ تأثرات

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ زندگی''.....مختصر تاثرات

عاصم رسول
فتح کدل، سرینگر کشمیر

(نوٹ: مولانا علی میاںؒ کی آپ بیتی ''کاروانِ زندگی (عربی: فی مسیرۃ الحیاۃ)'' کتاب پر میرا تبصرہ کرنا میری دانست میں سورج کو شمع دکھانے کے مرادف ہے۔ وجہ صاف ہے کہ خاکسار بے بضاعت اور تہی دامن اس ادب پارے کے بارے میں کیا خامہ فرسائی کر سکے گا۔ یہی سبب ہے اس کی ترتیب کے دوران مجھ پر سخت آورد کا غلبہ تھا۔ استادِ محترم ڈاکٹر شکیل شفائی صاحب کی تجویز پر میں نے کتاب کا مطالعہ کیا اور انہی کی فہمائش تھی کہ کچھ تاثرات رقم کروں تو میں نے اپنی طرف سے کچھ لکھنے کی بہ جائے زیادہ تر اس کتاب کے چند اقتباسات نقل کر دیے تا کہ ناظرین اس نابغہ روزگار شخصیت کی خودنوشت سوانح حیات کو پڑھیں تا کہ فکر و خیال کا ایک وسیع کینولیس ان کے سامنے کھل جائے۔ ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی صاحب کا شکر گذار ہوں جنہوں نے میری حقیر قلمی کاوش کو اپنے علمی و فکری جریدے میں شائع کر دیا بہ ہر حال ندائے اعتدال کے باذوق قارئین کے لیے مضمون پیش خدمت ہے۔)

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

تھامس کارلائیل (Thomas Carlyle) نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ:

''The history of world is but the biography of greatmen'' ''دنیا کی تاریخ بڑی شخصیتوں کی سوانح حیات ہی ہوتی ہے''۔

عظیم دانش ور، مؤرخ و سوانح نگار، مرشد و رہنما، مجدد و امام، عالم و داعی، مفسر و ادیب، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی علمی، فکری، ادبی، تصنیفی، تحقیقی، ملی و سماجی، دینی و روحانی خدمات کا احاطہ ایک مضمون میں کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس عظیم المرتبت شخصیت پر عربی، اردو اور انگریزی زبانوں میں بلا مبالغہ سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالات لکھے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ اس مضمون میں راقم سطور صرف اپنے احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا چاہتا ہے جو تاثرات و احساسات مفکر اسلامؒ کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' کے مطالعہ کے دوران دل پر مرتسم ہوئے۔

زیر نظر کتاب پڑھتے ہوئے جو پہلا نقش میرے دل پر قائم ہوا وہ یہ کہ ایک متحرک، فعال اور بھرپور زندگی آپ کے آنکھوں کے سامنے گردش کرتی ہے۔ رسول کریم ﷺ کی مبارک زندگی جہدِ مسلسل کی داستان ہے۔ نبوت کے ۲۳ سال میں ہمارے لیے یہ اسوہ ہے کہ مومن کبھی کسل مندی، غفلت، سستی اور اپنی ہی

دنیا میں مگن ہونے والی زندگی نہیں گزارتا بل کہ ایک ایک لمحہ اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ اسی چیز کی عکاسی آپ کو مولانا علی میاںؒ کی سوانح میں ملتی ہے جہاں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں والی چھاپ دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس تناظر میں علی میاںؒ کی پوری زندگی اسوہ رسول ﷺ کی تتبع میں گزری کہ ایک ایک سانس اللہ کی رضامندی کے کاموں میں گزار دی۔ کبھی آپ دائرہ شاہ علم اللہ یا تکیہ کلاں میں مطالعہ، تصنیف و تالیف میں مصروف دکھائی دیتے ہیں، کبھی لکھنو کے مضافات میں دعوت وتبلیغ کی ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں، کبھی آپ مسلم پرسنل لاء کے اجلاسوں اور میٹنگوں میں مسلمانِ ہند کے اسلامی تشخص کو قائم رکھنے کی جدوجہد کررہے ہیں تو کبھی 'پیام انسانیت' کے اسٹیج سے ابنائے وطن کو اسلام کے حیات بخش پیغام سے متعارف کروارہے ہیں۔ کبھی رابطہ ادبِ اسلامی کے فورم پر یہ عجوبۂ روزگار شخصیت ادب کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کی فہمائش کررہی ہے تو کبھی رابطہ عالم اسلامی کے پروقار اور مقتدر کانفرنسوں میں مسلمان ممالک کو ایک لڑی میں پرونے کی سعی بلیغ کررہی ہے۔ قاری کو اس جہاں دیدہ اور جہانِ دیدہ شخصیت کی متحرک زندگی کی لافانی سرگزشت 'کاروانِ زندگی' کے ورق ورق میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا علی میاں ندویؒ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''۲ ستمبر کو ترکی، یورپ، امریکہ اور حجاز مقدس کے سفر سے جب واپسی ہوئی تو سفری تکان، جمع شدہ ڈاک اور لکھنؤ اور رائے بریلی کے قیام کی مصروفیتوں اور ضرورتوں نے اس ارادہ اور فیصلہ میں تردد پیدا کردیا، اس درمیان مدت میں ضلع اعظم گڑھ کا سفر پیش آیا جو کار کے ذریعہ ہوا، وہاں مظفر پور (ضلع اعظم گڑھ) میں واقع عزیز گرامی مولوی تقی الدین ندوی کے قائم کردہ مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کی جو ایک چھوٹی کار کے ذریعہ ہوا، سڑکیں خراب اور بعض جگہ شکستہ تھیں، پھر بذریعہ کار مئو جانا ہوا، جہاں چار پانچ پروگرام پورے کرنے پڑے وہاں رفیق عزیز مولوی سعید الرحمٰن ندوی کی توجہ وتعلق سے ایک اچھی کار مل گئی، پھر خاص شہر اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامی میں شرکت کی اور وہاں سے بذریعہ کار ہی رائے بریلی واپسی ہوئی، تقریباً دوسو (۲۰۰) کلومیٹر بذریعہ کار جانا اور دوسو (۲۰۰) کلومیٹر بذریعہ کار آنا ہوا، رائے بریلی سے سلطانپور، وہاں سے جونپور اور وہاں سے اعظم گڑھ پہنچنا ہوا تھا، مظفر پور پہنچ کر ایسا تکان اور ضعف محسوس ہوا کہ ڈاکٹر کو بلانا پڑا، انہوں نے ٹسٹ کیا اور بتایا کہ بلڈ پریشر (low) ہے اور آرام کی ضرورت ہے، اس کے باوجود جس مقصد کے لئے یہ سفر ہوا تھا اس کی تکمیل نہ کرنے سے شرم آئی اور بعد مغرب جلسہ میں شرکت بھی کی اور طویل تقریر بھی'' (کاروان زندگی جلد ۵ صفحہ ۲۸۵۔۲۸۶)

علی میاں ندویؒ کی سرگزشت حیات کو پڑھتے ہوئے جو دوسرا تاثر قلب وذہن پر قائم ہوا وہ یہ کہ انہوں نے آپ بیتی کے ذریعہ ۲۰ ویں صدی کی تاریخ ہمارے سامنے رکھی ہے (واضح رہے مولانا علی میاں کی تاریخ پیدائش ۵ دسمبر ۱۹۱۳ء اور تاریخ وفات ۳۱ دسمبر ۱۹۹۹ء ہے)۔ لیکن جہاں انہوں نے زبردست مؤرخانہ اسلوب اختیار کیا وہیں روایت سے ہٹ کر واقعات کو صرف مرتب نہیں کیا بل کہ اس عہد کے لوگوں کے مزاج، سوچ، فکر، ذہنی خلشوں، دلوں کی دھڑکنوں اور خاص ماحول کو بے مثال ادیبانہ طرز پر الفاظ کا قالب پہنایا ہے۔ گویا جب آپ مشاہدات وواقعات کو پڑھتے ہیں تو خود کو اسی ماحول میں پاتے ہیں اور اس دور کے سرد وگرم حالات کو ذاتی طور محسوس کرتے ہیں۔ مولانا اس بارے میں لکھتے ہیں:

''تاریخ کے ذخیرہ پر ناقدانہ اور حقیقت پسندانہ نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ''سرکار دربار'' کے گرد گھومتی تھیں، ان میں زیادہ تر حکام ووزراء کے عزل ونصب یا بڑی جنگوں اور عظیم حوادث کی روئیداد ہوتی، اس کے بعد بھی زیادہ تر تاریخ کی کتابیں ایک لگے بندھے نظام کے ماتحت واقعات نویسی پر اکتفا کرتی ہیں، اور ان کو اس لحاظ سے

''عرفی'' واصلاحی'' تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، ان کے مطالعہ سے اس عہد اور ماحول کے لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں، دماغوں کی خلشیں، اور روحوں کے اضطرابات معلوم نہیں کئے جاسکتے، ان مسائل اور مصائب اور محسوس کئے جانے والے خطرات سے بھی آگاہی نہیں ہوسکتی، جنہوں سے اس عہد اور ملک کے باشعور اور صاحبِ ضمیر طبقہ کی نیند حرام کررکھی تھی۔۔۔یہ ''عرفی تاریخیں'' (اپنی فنی اور موضوعی قدر و قیمت کے باوجود) اس دور کی ذہنی و فکری، اخلاقی ونفسیاتی اور شعوری وجذباتی عکاسی سے قاصر ہیں، نہ ان کے مصنفین نے اس کا دعویٰ کیا ہے، اور نہ وہ اس کو اپنے فرائض میں سمجھتے تھے'' (کاروان زندگی جلد۴ صفحہ۱۰۔۱۱۔۱۲)

آگے اس تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ کتاب جو کوئی بڑی علمی و ادبی یا تحقیقی و تصنیفی قدر و قیمت نہیں رکھتی، بیسویں صدی عیسوی کے کم سے کم نصف ثانی میں سانس لینے والے اہم ملک (ہندوستان) اور عظیم ملت (مسلمانوں) کے حالات، جذبات واحساسات، واقعات اور واقعات کے رد عمل اور جیسا کہ کہا گیا کہ ''دلوں کی دھڑکنوں اور دماغوں کی خلشوں'' کے سمجھنے میں مدد دے گی، اور آئندہ کے مسلمان مورخ، یا انصاف پسند ہندوستانی مورخ کو بہت سے وہ معلومات ومواد فراہم کرے گی'' (ایضاً صفحہ نمبر۱۵)

تیسرا نقش جو میرے دل و دماغ پر ثبت ہوا وہ یہ کہ مولانا علی میاں ندویؒ میں داعیانہ تڑپ رگوں میں خون کی طرح گردش کرتی تھی موقع ومحل کوئی بھی ہو، کانفرنس، اجلاس واجتماع کسی نوعیت کا بھی ہو، مولاناؒ نے دعوت وتبلیغ کا کوئی موقع ہاتھ سے کبھی نہیں جانے دیا۔ عوام کو زندگی کی حقیقت سے روشناس کراتے رہے، عقیدۂ توحید، رسالت، اخرت اور نیک اعمال کا جذبہ عوام میں پیدا کرنے میں کسی قسم کا دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس سرگزشت حیات میں جہاں علی میاںؒ نے ذاتی زندگی کے احوال، میٹنگوں، کانفرنسوں، اجلاسوں اور اسفار کی روداد سنائی ہے وہیں اہم دینی، دعوتی، فکری، اصلاحی، سماجی، سیاسی اور علمی تقاریر سے بھی کتاب کو زینت بخشی ہے اور کتاب کے ساتوں حصے ان اصلاحی اور دعوتی تقاریر سے بھرے پڑے ہیں۔ مشتے نمونے از خروارے کے طور چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ مولانا علی میاںؒ کا جب بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء کا انتخاب ہوا تو ندوہ کی مالی حالت کافی خراب تھی تو اس سلسلہ میں ۱۹۶۱ میں وہ کویت مالی امداد کے لیے گئے اور امدادی تعاون کی بات کو مختصر کرکے لوگوں کی اصلاح اور دعوت دین کی طرف یوں متوجہ ہوئے:

''اگر کفارِ قریش موجودہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ لیں، تو سخت احتجاج کریں کہ ہمیں اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ مسلمان طالبِ دنیا و ریاست بن جائیں گے، ہم سے جنگ تو صرف ایک مخصوص دعوت، عقیدۂ توحید اور ایک نئی سیرت اور طرزِ زندگی کی بنیاد پر تھی، اگر مسلمانوں کو یہی کرنا تھا تو ہم نے پہلے ہی اس کی پیش کش کردی تھی، مگر اس کو ٹھکرادیا گیا'' (کاروان زندگی جلد۱ صفحہ۴۷۰)

۱۹۸۰ میں قیصر باغ لکھنو کی سفید بارہ دری میں 'پیام انسانیت' کے ایک جلسہ میں مولانا نے تقریر میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا (اللہ ان پر عذاب بھیجنے والا نہیں اس حالت میں کہ آپ ان میں موجود ہیں) ہم اس رسولؐ کی امت ہوکر جس کو رحمۃ للعالمین کا خطاب دیا گیا ہے اور جس کا وجود عذاب الٰہی کے لئے مانع تھا، کسی ملک میں موجود ہوں اور ۸ کروڑ اور ۱۰ کروڑ کی تعداد میں ہوں، اور وہاں ایسے واقعات دن رات پیش آرہے ہوں جو خالق کائنات کو ناراض کرنے والے اور اس کے ہولناک نتائج کا پیش خیمہ ہوں، یہ بات مسلمانوں کی اس ذمہ داری کے ساتھ میل نہیں کھاتی جو ان کے دین، ان کے اسلاف اور ان کی تاریخ نے ان کے سپرد کی ہے، ہم اس نبیؐ کی امت ہیں جس نے عربوں کی دختر کُشی کی رسم اس طرح مٹائی کہ اگر سیرت و

تاریخ نہ ہوتی تو کوئی یہ بھی نہ جانتا کہ عربوں کے یہاں کس دور میں یہ ظالمانہ رسم تھی‘‘ (کاروان زندگی جلد۲صفحہ۱۲۷)

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۲ کو حیدآباد میں جمیل الدین خان ایڈوکیت کے دولت خانہ پر علمائے کرام، فضلائے مدارس اور دینی اداروں اور تنظیموں کے سربراہوں کے سامنے ایک پُر تاثیر تقریر میں مولانا نے فرمایا:

’’آپ اگر مسلمانوں کو سو فی صدی تہجد گزار بنادیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنادیں لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جارہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی، وبا اور طوفان کی طرح پھیل رہی ہے ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہورہی ہے تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا‘‘ (ایضاً صفحہ نمبر۳۷۳)

۱۹۹۲ میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک اجلاس میں صدارتی خطاب کے دوران نکاح کی حکمت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا علی میاں گویا ہوئے:

’’عقد اور نکاح کیا ہے؟ یہ بھی ایک مہذب اور مبارک سوال ہے، ایک شریف خاندان نے ایک دوسرے شریف خاندان سے سوال کیا کہ ہمارے نورِ عین اور لختِ جگر کو رفیقہ حیات کی ضرورت ہے، اس کی زندگی نامکمل ہے، اس کی تکمیل کیجئے، دوسرے شریف خاندان نے اس سوال کو خوشی سے قبول کیا، پھر وہ دونوں اللہ کا نام بیچ میں لاکر ایک دوسرے سے مل گئے اور دو ہستیاں جو کل تک ایک دوسرے سے سب سے زیادہ بے گانہ، سب سے زیادہ اجنبی اور سب سے زیادہ دور تھیں، وہ ایسی قریب اور یگانہ بن گئیں کہ ان سے بڑھ کر یگانگت اور قرب کا تصور بھی نہیں ہوسکتا، ایک کی قسمت دوسرے سے وابستہ اور ایک کا لطف و انبساط دوسرے پر منحصر ہوگیا، یہ سب اللہ کے نام کا کرشمہ ہے، جس نے حرام کو حلال، ناجائز کو جائز، غفلت و معصیت کو طاعت وعبادت بنادیا اور زندگیوں میں انقلاب عظیم برپا کردیا، اللہ فرماتا ہے کہ اب اس نام کی لاج رکھنا، بڑی خود غرضی کی بات ہوگی کہ تم یہ نام درمیان میں لاکر اپنی غرض پوری کرلو اور کام نکال لو، پھر اس پُرعظمت نام کو صاف بھول جاؤ، اور زندگی میں اس کے مطالبات پورے نہ کرو، پھر فرمایا کہ ہاں رشتوں کا بھی خیال رکھنا، اس رشتہ سے قدیم رشتوں کا دور اور ان کے حقوق ختم نہیں ہوجاتے اور اگر کسی دل میں یہ خیال آئے کہ ایسی باتوں کی کون نگرانی کرے گا، اور کون ہمیشہ ساتھ رہے گا تو فرمایا ’’اللہ تعالیٰ دائمی نگراں اور محاسب ہے‘‘ (کاروان زندگی جلد۵صفحہ۲۶۲۔۲۶۳)

مولانا علی میاں ندویؒ ایک ہشت پہل ہیرے کے مانند تھے ان کی زندگی کے مختلف الجہات پہلو ہیں۔ ان کا ایک نمایاں اور خاص وصف یہ تھا کہ وہ بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زیرنظر کتاب کی ادبی حیثیت بامِ عروج کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس کتاب کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک فقرے پر باذوق قاری عش عش کرنے لگتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ کتاب کے ایک ایک جملہ کو اپنے رگ و پے میں جاں گزیں کردے۔ مولانا علی میاں رابطہ ادب اسلامی کے موسس بھی تھے اور ادبِ اسلامی کے حوالے سے ان کی خدمات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس کتاب کا کوئی بھی حصہ پڑھیے ادبی چاشنی محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتے۔ پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب مولانا علی میاں ندویؒ پر مجلّہ تعمیر حیات کے خصوصی شمارہ میں اپنے مضمون میں لکھتے ہیں ’’حضرت مولاناؒ کی تحریر اتنی دلکش کیوں ہوتی ہے اور کیوں لوگوں کے احساسات کو چھوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی تحریر میں مجرد افکار ہوں یا خالص حقیقتوں کا بیان ہو تو گو وہ ایک علمی تحریر ہوگی مگر اثر ڈالنے والی نہ ہوگی۔ مولاناؒ کا بیان حقیقت جذبات کی شکل میں دل میں ورود کرتا ہے۔ مولانا کی زبان کی ہم آہنگی اس درجہ کی ہے کہ اس سے اونچا درجہ تخیل میں نہیں آتا‘‘۔ مولانا کی خود

نوشت سرگزشت حیات ایک ادبی گلستان ہے جہاں آپ کو ادبی شگوفے کھلے ہوئے نظر آئیں گے۔ دارالمصنفین کی طرف سے ۱۹۸۱ میں ایک سیمی نار میں مولانا نے ادب پر ایک لاجواب تقریر کی جس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''ادب ادب ہے خواہ وہ کسی مذہبی انسان کی زبان سے نکلے، کسی پیغمبر کی زبان سے ادا ہو یا کسی آسمانی صحیفہ میں ہو، اس کی شرط یہ ہے کہ بات اس انداز سے کہی جائے کہ دل پر اثر ہو، کہنے والا مطمئن ہو کہ میں نے بات اچھی طرح کہہ دی، سننے والا اس سے لطف اٹھائے، اور اس کو قبول کرے، حُسن پسندی تو یہ ہے کہ حسن جس شکل میں ہو اسے پسند کیا جائے، بلبل کو آپ پابند نہیں کر سکتے کہ اِس پھول پر بیٹھے اُس پھول پر نہ بیٹھے، یہ کہا کا حسن مذاق اور کہاں کی حق پسندی ہے کہ اگر گلاب کا پھول کسی میخانہ کے صحن میں اس کے زیر سایہ کھلے تو وہ گلاب ہے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے اور اگر کسی مسجد کے چمن میں کھل جائے تو پھر اس میں کوئی حسن نہیں؟ کیا یہ جرم ہے کہ اس نے اپنے نمود اور اپنی جلوہ نمائی کے لئے مسجد کا سہارا لیا؟ بقول اقبالؒ ؎

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے بن
اگر شہروں سے پیارے ہوں تو شہرا چھے کہ بن؟

ہمیں حُسن بے پروا سے مطلب ہے کہ شہر و صحرا سے؟ لیکن ادب کے ساتھ یہی معاملہ کیا گیا۔'' (کاروان زندگی جلد ۲ صفحہ ۳۳۱۔۳۳۲)

ایک اور چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ یہ کہ یہ ایک ایسے شخص کی سرگزشتِ حیات ہے جو دینی حمیت و غیرت سے متصف ہے۔ یہ شخص اپنے دور کے طاقت ور حکم رانوں، بادشاہوں اور امراء و وزراء کے ساتھ بالمشافہ ملاقات بھی کرتا ہے اور خطوط بھی لکھتا ہے، جن میں جرأت و نڈرتا سے ان کی غلط پالیسیوں پر ان کو ٹوکتا ہے اور حقیقی صورت حال کی طرف ان کی توجہ مبذول کرواتا ہے۔ پھر چاہے وہ عرب وامارات کے بادشاہ ہوں یا پھر اپنے ملک کے صدور و وزرائے اعظم یہ لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر احقاق حق کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ مولانا علی میاں ندویؒ استغنیٰ کے پیکر دکھائی دیتے ہیں کسی لمحہ بھی مرعوبیت سے کام نہیں لیا بل کہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ اور یہی بے باقی تھی اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے دلوں پر اس شخصیت کا رعب بٹھایا تھا۔

بہر حال مولانا علی میاں ندویؒ کی 'آپ بیتی' سات ضخیم جلدوں اور ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے پیدائش (۱۹۱۳) سے لے کر ۱۹۶۵ء تک کے حالات و واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ابتدائی تعلیم اور شیخ خلیل عرب اور دوسرے اساتذہ سے استفادہ اور عربی زبان وادب سے اپنی دل چسپی اور بعد میں اپنی بعض تصانیف اور شخصیات، تحریکات سے تعلق پر تفصیل سے لکھا ہے۔ کاروان زندگی کی پہلی جلد کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے باقی چھ جلدوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ دوسری جلد ۱۹۶۶ء سے لے ۱۹۸۳ تک کے حالات و وقعات اور ملکی و غیر ملکی اسفار پر مشتمل ہے۔ تیسری جلد ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۷ء کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ چوتھی، پانچوی، چھٹی اور ساتویں جلدیں بالترتیب ۱۹۸۸ سے لے کر ۱۹۹۰ تک، ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۶ء تک اور ۱۹۹۷ء سے جولائی ۱۹۹۹ء کے حالات، حوادث اور واقعات، احساسات و تاثرات پر مشتمل ہیں۔ اور بقول مصنف یہ کتاب ایک دلچسپ و سبق آموز ''آپ بیتی'' اور ایک مؤرخانہ و حقیقت پسندانہ ''جگ بیتی'' بن گئی ہے۔ یہ سرگزشت حیات جہاں قاری کو مولانا کے عقیدہ، نظریہ، سوچ، فکر، مؤقف، منہج، اور طریقہ کار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے وہاں پوری ایک صدی ملی، دینی، علمی اور تہذیبی تاریخ بھی نگاہ سے گزرتی ہے۔

☆☆☆

بقلم : ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

ماہنامہ الفرقان (خصوصی اشاعت بعنوان ذکر حفیظ)

صفحات: ۱۳۰/مشترکہ شمارہ: بابت اگست/ستمبر ۲۰۲۰ء

مدیر: مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی

الفرقان کے تازہ شمارے کو معروف صحافی حفیظ نعمانی مرحوم (۱۹۳۰ء- ۲۰۱۹ء) کے ذکر کے لیے خاص کیا گیا ہے، ۱۳۰/صفحات پر مشتمل اس شمارے کے ۱۱۶/صفحات میں حفیظ صاحب کی حیات وخدمات کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے جبکہ بقیہ صفحات میں دیگر چیزیں ہیں، ۱۰۴/صفحات میں پھیلا ذکر حفیظ مدیر محترم کے قلم سے ہے جبکہ ایک مضمون حفیظ صاحب کے دوسرے بھائی مولانا حسان نعمانی کے قلم سے ہے جس میں گھریلو تعلقات اور ذاتی خصوصیات کا ذکر بڑے پرکشش انداز میں کیا گیا ہے، سرسری نظر ڈالنے والے قاری کو بھی ممدوح کی متنوع شخصیت اور گوناگوں خدمات کا علم ہوجائے گا، کیا خوب ہوتا کہ الفرقان کا یہ نمبر مختلف اہل قلم کے مضامین پر مشتمل ہوتا، یقیناً مدیر الفرقان کا شمار ملک کے بڑے علماء اور لائق احترام اہل فکر میں ہوتا ہے لیکن جو بات اہل قلم کے تنوع اور مضامین کے تعدد سے پیدا ہوتی اور ''خاص نمبر'' کی جو شان ہوتی وہ اس نمبر کو حاصل ہونا بہرحال مشکل ہے، ممکن ہے اس خیال سے خود ہی ان کی شخصیت کا مرقع پیش کرنے پر اکتفا کیا ہو کہ ان کی زندگی میں ہی ان کے بھانجے اویس سنبھلی صاحب نے ''قلم کا سپاہی'' نام سے ایک کتاب مرتب کردی تھی، کیا بہتر ہوتا کہ اس نمبر کی ضخامت میں کچھ اضافہ کیا جاتا اور اس کے اقتباسات شامل کردیے جاتے تو بھی تنوع کے تقاضے پورے ہوجاتے، مدیر محترم کو اس کا احساس تھا جس کا انھوں نے ''نگاہ اولیں'' کے آخر میں اظہار کیا ہے لیکن اس سے بات بہرحال نہیں بنتی۔

حفیظ نعمانی کی زندگی کا بیشتر حصہ جدوجہد میں گذرا ہے، اس اعتبار سے اس خاص نمبر کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ مدیر محترم نے آج کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے کشمکش ومزاحمت اور جدوجہد کی ایک پُرعزم داستان اس میں نقل کردی ہے، ''نگاہ اولیں'' کے پہلے ہی صفحہ پر انھوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ حالات آج جتنے ابتر ہیں آزادی کے معاً بعد اس سے کہیں زیادہ بدتر تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مفاد پرستوں کی بھیڑ کم تھی، ریاکاروں کو صف اول میں جگہ کم ملتی تھی، مقصدیت (خواہ اس سے کسی کو اختلاف ہو) ہمیشہ سامنے رہتی تھی، احساس زندہ تھا، گھریلو آسائش اور پیٹ پر ملت کو ترجیح دینے والوں کی کثرت تھی مگر آج — مدیر محترم نے سچ لکھا ہے، حرف حرف سے اتفاق ہے اور شاید ہی کہیں کوئی اس سے بری ہو، کہیں مال کی ہوس، کہیں منصب کی حرص، کہیں خاندانی تسلط واجارہ داری کی طلب کہیں، تنظیمی گروہ بندی نے ''ایثار وقربانی'' کو عنقا بنا دیا ہے، اب بس ''ایثار وقربانی'' کی بات زبانی جمع خرچ کے لیے ہے، ہر شخص دوسروں سے ایثار وقربانی کا طلبگار ہے خود اپنے نفس اور اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہوکر ملت کو فریب دینے میں کسی کو کوئی باک نہیں، مدیر محترم لکھتے ہیں:

''پریشانی کی بات بالکل یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ۷۰/ برس میں حالات ٹھیک نہیں ہوسکے، پریشانی کی بات اگر ہے تو یہ ہے کہ ہماری غالب اکثریت کے اندر ابھی تک اجتماعی اور

قومی شعور بیدار نہ ہوسکا، حالات کو درست کرنے کے لیے جو سنجیدگی، جوفکرمندی اور جوعزم اور ایثار قربانی درکار ہے وہ ہماری اکثریت کے اندر نظر نہیں آتا، زیادہ تر ''دین دار'' اپنی ''دین داری'' میں اور ''دیندار'' اپنی ''دنیاداری'' میں مطمئن اور مست نظر آتے ہیں۔(ص ۷)

سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا اسی کے نتیجہ میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حفیظ صاحب کے زمانہ جدوجہد اور آج کے حالات میں بہت فرق ہے، اب اس ملک میں سیکولرزم محض دل کے بہلانے والا ایک خیال ہے یا پھر موہن بھاگوت کی ''زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں سیکولرزم مضبوط ہورہا ہے اور آر ایس ایس اس کے لیے کوشاں ہے،'' اس وقت بہرحال سیاست میں شرافت باقی تھی خواہ آخری سانسیں ہی لے رہی تھی، رواداری تھی، رکھ رکھاؤ تھا، شاید حالات، اقدار، سیاست اور سبھی کچھ کی یکسر تبدیلی نے اچھے اچھوں کو خاموش ہوجانے پر مجبور کردیا۔

۲۰۰۴ء کے بعد سے حفیظ صاحب کا قلم بھی کسی حد تک خاموش رہا یہ الگ بات کہ وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات میں ان کے مضامین آتے رہے، البتہ آخری دور کے ان مضامین میں وہ بات نہ رہی تھی جو حفیظ صاحب کے قلم کی پہچان تھی، بعض مرتبہ تو لگتا کہ وہ خود کے سوا کسی پر اعتماد ہی نہیں کرتے، بعض مرتبہ منفیت کا غلبہ ہوتا ممکن ہے کہ یہ عمر بھر کے تلخ تجربات کا نتیجہ رہا ہو، ورنہ یہ امر واقعہ ہے کہ حفیظ نعمانی صاحب کے یہاں رعایت ومصلحت بمعنیٰ مداہنت کا کوئی عنصر نہ تھا، وہ مزاج کے کھرے تھے اور تحریروں میں بھی کھرا پن ہوتا تھا، ان کی حساسیت، ملی فکرمندی اور ان کا بالغ ملی شعور انھیں صاف اور سادہ لفظوں میں سیدھی سیدھی بات لکھنے پر مہمیز کرتا تھا، وہ انتہائی نفیس وسلیس زبان میں سچائی کو صفحات پر بکھیر دیتے تھے، مجھے حفیظ صاحب سے کبھی شرف ملاقات حاصل نہ ہوسکا سوائے ایک مرتبہ کے، جن دنوں سیمی پر پابندی لگی میں ندوۃ العلماء میں تخصص کا طالب علم تھا، ان دنوں لکھنؤ سے ''جدید عمل'' نامی اخبار حفیظ صاحب کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا، حفیظ صاحب کے اداریوں کی دھوم تھی، ندوے کے طلبہ عالم شوق میں اخبار کا انتظار کرتے تھے، راقم سطور ندوے کے جداری پرچوں میں (Wall Magazines) میں مضامین لکھنے کی مشق کرتا تھا، سیمی پر پابندی لگی تو جوش وحمیت سے مغلوب ہوکر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''حکومت کے ماتھے پر کلنک کا ایک اور ٹیکہ''، ساتھیوں نے کہا ''یار یہ مضمون جداریہ کے علاوہ کسی اخبار میں بھی آنا چاہیے''، سوچا کہ ایسا مضمون تو اسی اخبار میں آسکتا ہے جس کے مدیر حفیظ نعمانی جیسے جری قلم کے مالک اور صاحب صدق وصفا اور قلم کی آبرو ہیں، بس کیا تھا، اخبار کے آفس برلنگٹن ہوٹل کا رخ کیا، دفتر میں داخل ہوا، سامنے حفیظ صاحب کی بارعب شخصیت تھی اور دوسری طرف اس بے مایہ اور بظاہر بے حیثیت نوجوان کے ہاتھ میں چار پانچ صفحہ میں ہاتھ ہی سے لکھا ہوا مضمون، حفیظ صاحب نے مضمون پڑھا بلکہ ایک نظر ڈالی اور پھر سمجھا بجھا کر یہ کہیے کہ بہلا کر بھیج دیا، کہا ابھی آپ اور مشق کیجئے یہ مضمون مصلحت کے خلاف ہے اس لیے نہیں چھپ سکتا، بہرحال وقتی طور پر مایوسی تو ہوئی مگر ظاہر ہے کہ اس ''مصلحت'' کی مختلف شکلیں اب تک دیکھ بھی رہا ہوں اور سیکھ بھی رہا ہوں جس کی طرف اس وقت کہنہ مشق اور طویل تجربہ کے حامل صحافی نے اشارہ کیا تھا۔

خیر بات سے بات نکل گئی، ذکر تھا الفرقان کی خصوصی اشاعت کا تو مدیر محترم نے آگے ان مایوس کن حالات اور منفی پہلوؤں کے بالمقابل حوصلہ افزا اعلامات اور مثبت پہلوؤں کا ذکر کیا ہے، بالخصوص چند ماہ قبل جامعہ وعلی گڑھ کی طلبہ تحریک کا تذکرہ کیا ہے، ماضی کے بزرگوں کی امیدیں نقل کی ہیں مگر صد افسوس کی زمینی حقیقتوں پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ یہ باتیں محض خوش فہمی پر مبنی رہ گئی ہیں، یہ ملت اپنی تباہی کی طرف بڑھ ہی نہیں رہی ہے بلکہ خودکشی پر آمادہ نظر آتی ہے، جس میں اس کے خواص کے

قول وعمل کا تضاد سب سے بڑا سبب ہے، مدیر محترم نے شیخ الہند کے خطبہ سے ان مثبت علامات کو مزین ومؤکد کیا ہے، یقیناً وہ جانتے ہوں گے کہ شیخ الہند کو اب ان اداروں کے طلبہ کیا ان کے اساتذہ نہیں جانتے چہ جائیکہ ان کی امیدوں اور ان کے افکار کو حرز جاں بنایا جاتا، یہ بھی حقیقت ہے کہ اس عبقری مجاہد کو دانستہ طور پر خود اسی کے مرکز میں فراموش کیا گیا بلکہ ان کے انقلابی افکار کو تقریباً ''جلاوطن'' کر دیا گیا جس پر مایوسی کا اظہار وہ خود ہی کر گئے۔

بہر حال ان اداروں کے تحفظ، ان کے اقلیتی کردار کی بحالی، ان کی شناخت اور ملی شعور کی حفاظت کے لیے جن بے لوث سرفروشان ملت نے اپنا خون پسینہ بہایا ہے ان میں قاضی عدیل عباسی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور حفیظ نعمانی جیسے لوگ قافلہ سالاروں میں تھے، اس خاص رسالہ میں مدیر محترم نے خاص طور پر حفیظ صاحب کی ملی زندگی، مسلم یونیورسٹی کی شناخت بچانے کے لیے ان کی تگ ودو کی ایک جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔

مدیر محترم کا طویل مضمون ''شفقت ومحبت، خلوص و وفا اور حق گوئی کی ایک مثال حفیظ نعمانی'' سے معنون ہے، صاحبِ مضمون نے ابتدا میں بچپن کی گھریلو یادوں کا ذکر کیا ہے، حفیظ صاحب کی شخصی خصوصیات، مروت ووضعداری اور خوئے وفا پر روشنی ڈالی ہے، ان کے اسلوب نگارش پر روشنی ڈالی ہے، مشہور ادیب وشاعر جناب رئیس الشاکری ندوی کے یہ جملے یہاں نقل کر دینے کو جی چاہتا ہے:

''حفیظ بھائی کو پڑھیے تو لگتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں، ایسی باتیں کہ ان کا قاری فکر ونظر کی بارش میں بھیگ بھیگ جائے، چھوٹے چھوٹے جملے لیکن تاثیر سے بھرپور، نوک پلک پر نگاہ، زبان و بیان کا سحر، معانی ومفہوم کی تہہ داریاں، ترسیل کا حسن، سلاست وروانی اپنی مثال آپ.....'' (ص ۲۱)

اس کے بعد سید عبدالرب صوفی صاحب سے ان کے تعلق وعقیدت پر کچھ گفتگو کی ہے، پھر ایک عنوان لگایا ہے ''سپاہیانہ مزاج وکردار'' دراصل یہی وہ پہلو ہے جس پر اس شمارے اور اس طویل مضمون میں صاحب مضمون اور مدیر محترم نے گفتگو کرنا چاہا ہے، ظاہر ہے کہ آج کے حالات میں اس مزاج وکردار کی ضرورت زمانۂ گذشتہ کے مقابلہ کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے، اگر آزادی کے متصلاً بعد ہندو احیاء پرستی اور اس پر حکومت کی چشم پوشی یا پردہ کے پیچھے سے سرپرستی نے مسائل کھڑے کر دیے تھے اور ایک مسلسل جدوجہد کا دور چل پڑا تھا تو آج حکومت خود ہی ہندو احیائیت کی علمبردار ہے، آئینی حقوق پر اب ملک کی پارلیمنٹ کھلم کھلا حملہ آور ہے، ان کے تحفظ کے لیے اب پہلے سے زیادہ منظّم ومنصوبہ بند اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے یہاں جدوجہد میں کمی نہ رہی، قوم نے بھی دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح اپنے قائدین کا تعاون کیا، اس رسالہ کو پڑھ جائیے تو اس پہلو سے نہ صرف حفیظ صاحب کی شخصیت کی یہ جہت بھی سامنے آئے گی بلکہ اور بہت کچھ ہاتھ آئے گا، مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک غلطی تقسیم کے بعد ہوئی اور دوسری تسلسل کے ساتھ آزادی کے بعد سے تاہنوز ہو رہی ہے، بحیثیت مجموعی قومی اعتبار سے ہمارا نہ کوئی ٹھوس منصوبہ ہے اور نہ مضبوط لائحۂ عمل اور نہ متحدہ جدوجہد جس کا نتیجہ ہے کہ ہزاروں اداروں اور سینکڑوں تحریکات کے باوجود آج اس قوم کا شیرازہ منتشر ہے اور سیاسی، سماجی اور تعلیمی ومعاشی محاذ پر وہ شکست خوردہ اپنے مستقبل کے لیے حیراں وسرگرداں ہے۔

بہر حال اس طویل مضمون سے قلم کے ایک سپاہی کی ایک ایسی طویل داستان سامنے آتی ہے جو نہ صرف مہمیز کا کام کرتی ہے بلکہ بعض اسرار سے پردہ اٹھاتی ہے، سرگوشی کے انداز میں بہت کچھ کہتی ہے، کبھی صراحت سے اعلان حق کرتی ہے، ملی تشخص کی تڑپ پیدا کرتی ہے، آئینی حقوق اور اس کے تحفظ کی خاطر ذمہ داریوں کا احساس دلاتی ہے ''ندائے ملت'' اور اس سے حفیظ صاحب کی وابستگی اور اس کی جرأت مندانہ کہانی ملی شعور کو

تازگی اور بالیدگی عطا کرتی ہے، اس کا ''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی'' نمبر آج بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جس نے وابستگان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا، جس نے حکومت کی نیدیں حرام کردی تھیں، جس نے کانگریس کے بدترین منصوبوں کا پردہ فاش کردیا تھا، کاش ''کانگریس کے ذہنی غلام'' اسی وقت اس حقیقت کو بھانپ لیتے اور اپنا قبلہ بدل لیتے اور یہ سمجھ لیتے کہ سیکولرزم کے ریشمی لباس میں ملبوس یہی وہ جماعت ہے جو آر ایس ایس کے نظریات بلکہ اس کی جڑوں کو مضبوط کررہی ہے، تو آج یہ حال نہ ہوتا کہ کانگریس کے لیے کاسۂ گدائی لے کر پھرنے والے مقربین وفدائین بھی جنبش لب کو ترس رہے ہیں، اس مضمون میں اس ''نمبر'' اور اس کے پسِ منظر پر گفتگو ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کی ان خصوصیات اور روایات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کے سبب وہ ہمیشہ ارباب حکومت اور ہندو احیائیت پرستوں کی آنکھ کا شہتیر بنی رہی، جس کے سبب اس کے اس پہلو کو ختم کرنے کے لیے وہ آرڈیننس لایا گیا تھا جو بظاہر اس کے اقلیتی کردار کو سلب کرنے کے لیے تھا، افسوس ہے کہ آج خود مسلم یونیورسٹی کے طلبہ واساتذہ اس کے اس کردار اور ان خصوصیات سے نابلد ہیں، ضرورت ہے کہ مضمون کے اس حصہ کو ہر ممکن شکل میں ان تک پہنچایا جائے، مدیر محترم نے نہایت خوش اسلوبی سے حفیظ صاحب کی زندگی کے اس حصہ پر روشنی ڈالی ہے، جس سے ایک طرف ''ندائے ملت'' کی اس جنگ سے واقفیت ہوتی ہے جو خالص ملی شعور اور آئینی حقوق کے تحفظ کے لیے چھیڑی گئی تھی، دوسری طرف حفیظ صاحب کے سپاہیانہ کردار کا اندازہ ہوتا ہے، تیسری جانب یہ علم ہوتا ہے کہ کانگریس کو سمجھنے میں مسلمانوں کے اس طبقہ سے ہمیشہ اور تسلسل کے ساتھ فاش غلطی ہوتی رہی، وہ ایک مسلم مخالف جماعت تھی اور ہے، بس اس کے چہرہ پر اس کے منافقانہ طرز عمل نے پردہ ڈال رکھا ہے، اس کے بڑے لیڈران آر ایس ایس سے وابستہ رہے، مشورے کرتے رہے بلکہ آر ایس ایس کانگریس کی سرپرستی میں پھلی پھولی اور پلی بڑھی، اس کے وزیر تعلیم چھاگلا نے ہی یہ اعلان کیا تھا کہ ''میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لفظ مسلم نکال کر دکھاؤں گا''۔ اس مضمون میں کانگریس کے متعلق حفیظ صاحب کی تقریباً یہی رائے نقل کی گئی ہے کہ کانگریس نے ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دیا، اور اسی روش پر چل کر اس نے انتخابات میں کامیابیاں حاصل کیں، سچ پوچھیے تو کانگریس نے ہی اپنی انتخابی سیاست کے لیے فرقہ واریت (Communalism) کو اس ملک میں فروغ دیا، مدیر محترم کے الفاظ میں حفیظ صاحب کے احساس کی ترجمانی ملاحظہ کیجیے:

''گویا یہ بات کنفرم ہوگئی کہ کانگریس مسلم قائدین کو صرف وہیں سے ٹکٹ دینے کی ہمت کرسکتی ہے جہاں کے رائے دہندگان کی اکثریت مسلم ہو، وہ اپنے ہندو ووٹروں سے کسی مسلم امیدوار کو ووٹ دینے کی اپیل کرنے کی ہمت نہیں رکھتی، اور اس کا صاف مطلب یہی تھا اور ہے کہ متحدہ قومیت کا سبق صرف مسلمانوں کو پڑھا کر ان کو اپنے تہذیبی تشخص کے احساس سے محروم کرکے انھیں ہندو معاشرے اور تہذیب میں ضم کردینا ہی کانگریس کا اصل ہدف تھا، ہندوؤں کو متحدہ قومیت کے رشتے سے دوسرے فرقوں سے قریب لانا، اور ان کے ذہن سے فرقہ واریت کو دور کرنا اس کے پروگرام میں روز اول سے ہی نہیں تھا۔'' (ص ۸۲-۸۳)

اس مضمون میں آگے ''روداد قفس'' کے اقتباسات و بیانات درج کیے گئے ہیں، جو نہ صرف بہت کچھ بیان کرتے ہیں بلکہ قلم کے سپاہیوں اور حریت پسندوں کے لیے بڑا حوصلہ افزا سبق پیش کرتے ہیں، حفیظ صاحب کی اصول پسندی اور جہد مسلسل کی تصویر سامنے آتی ہے، ایک ذمہ دار شہری اور ایک مرد مسلمان کی ذمہ دارانہ زندگی گذارنے کی جھلکیاں سامنے آتی ہیں۔

بحیثیت مجموعی ''الفرقان'' کا یہ شمارہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے، صرف اس لیے نہیں کہ اس سے حفیظ نعمانی مرحوم کی شخصیت اور جہد مسلسل سے عبارت ان کی زندگی سے واقفیت حاصل ہوتی

ہے، ان کی بعض شخصی خصوصیات اور گھریلو زندگی کا علم ہوتا ہے، ان کی دینداری اور قرآن مجید سے ان کے شغف کا راز کھلتا ہے، حفیظ صاحب حافظ بھی تھے، تراویح بھی سناتے تھے، ایک آدھ سال کا وقفہ ہوگیا تو جیل میں ہی دوبارہ پختہ کر کے تراویح میں سنایا، مولانا احسان نعمانی کے مضمون سے علم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر چھوٹوں پر شفقت کرتے تھے، گھر کے ماحول میں کیسی یگانگت و رواداری اور ایک دوسرے کی رعایت واحترام تھا، شخصی خصوصیات کے تذکرے پڑھتے ہوئے بعض جگہ آنکھیں نم ہوجاتی ہیں، اس شمارے کا مطالعہ دراصل اس لیے بھی اہم ہے کہ اس سے نظریہ سازی اور منصوبہ بندی میں مدد ملے گی، ترجیحات کو سمجھنے اور ان کی تعیین میں آسانی ہوگی، رگِ غیرت میں حرکت آئے گی، درپیش خطرات کا احساس ہوگا، سیاست کے نفاق کو سمجھنے میں مدد ملے گی، جدوجہد کا جذبہ پیدا ہوگا اور قلم کے مثبت استعمال کا احساس جاگے گا، کمیوں اور کوتاہیوں سے کون بری ہوسکتا ہے؟ مگر بحیثیت مجموعی اس شمارے کو پڑھ کر لب یوں گویا ہوئے کہ ؎

کیا شخص تھا جو راہ وفا سے گذر گیا
جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

☆☆☆

بقلم : ڈاکٹر محمد طارق ایوبی
نام کتاب : متاعِ شمیم
صفحات : ۱۰۴
قیمت : ۱۰۰/روپیے
شاعر : شمیم بارہ بنکوی
ملنے کا پتہ : دانش محل، امین آباد، لکھنؤ

عجیب بات ہے کہ بارہ بنکی کا علاقہ تعلیمی لحاظ سے پسماندہ شمار کیا جاتا ہے لیکن علم وادب کی تاریخ میں بارہ بنکی کے نامورانِ قلم کا ذکر نہ کیا جائے تو تاریخ ادھوری رہ جاتی ہے، بالخصوص اردو نثر ونظم کی خدمت اور اس کے گیسو سنوارنے میں اس خطۂ اودھ نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

محمد شمیم خاں شمیم بارہ بنکوی اسی فیض رساں اور ذریں سلسلہ کی اہم کڑی ہیں، وہ بارہ بنکی کے مشہور ومعروف اور باکمال شاعر عزیز بارہ بنکوی مرحوم کے تلامذہ میں ہیں، اس حیثیت سے وہ بزم عزیز کی خوبصورت یادگار ہیں، عمر کے اس مرحلہ میں ان کا تیسرا مجموعۂ کلام ''متاعِ شمیم'' منظر عام پر آیا ہے، جبکہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''لالہ وگل'' ۱۹۷۹ء میں اور دوسرا ''فکرِ گل افشاں'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے۔

شمیم صاحب کی شاعری میں کلاسیکی شاعری کا رنگ نمایاں ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ کلاسیکی غزل کے امین و پاسدار ہیں، لیکن کبھی کبھی غمِ جاناں سے نکل کر غمِ دوراں کو بھی غزل کا رنگ دے دیتے ہیں، زندگی کا اتار چڑھاؤ، جذبات کی عکاسی، واردات قلبی کی ترجمانی اور افکار کا تنوع بھی ان کی شاعری میں نظر آتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ کلاسیکی معنی میں ''غزل'' کے اسیر نظر آتے ہیں مگر کبھی کبھی وہ بڑی خوبصورتی سے مسائل و تجربات بیان کر جاتے ہیں، شمیم صاحب کی شاعری میں لہجہ کی شرافت وشائستگی ہے، فکر کی شگفتگی ہے، فن کی پختگی و رعنائی ہے، جابجا حساسیت کا اظہار ہے جس سے شاعری کا پرکشش ہوجانا طبعی ہے۔

اس مجموعہ میں شمیم صاحب کی نعتیں بھی ہیں، غزلیں اور نظمیں بھی، نعتیہ شاعری کا میدان انتہائی حساس ہے، نذرانۂ عقیدت پیش کرنا اور بات ہے لیکن فن کارانہ مہارت کے ساتھ نعت کی ''پرخطر'' وادی سے بے علم ومطالعہ بچ کر گذر جانا ممکن ہی نہیں، شمیم صاحب نے نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں لیکن فکری ومعنوی اعتبار سے وہ اس میدان کو

سرنہ کر سکے ہیں، پھر بھی متعدد خوبصورت اور شاندار شعر کہتے میں کامیاب ہوگئے ہیں، حضورؐ کی سیرت وہی ہے جو کچھ قرآن میں ہے، قرآن کہتا ہے إنك لعلى خلق عظيم اور حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کان خلقه القرآن، شمیم صاحب کہتے ہیں ؎

روئے پرنور سے محروم نہیں ہیں آنکھیں
سامنے میرے ہے قرآن مدینے والے

ایسے اور بھی کئی خوبصورت شعر اس مجموعہ کی زینت ہیں ؎

سرکار کو جو اپنا بنائے ہوئے ہیں لوگ
اللہ کی نظر میں سمائے ہوئے ہیں لوگ
دیوانگیٔ شوق کی معراج دیکھنا
یادِ نبیؐ میں خود کو بھلائے ہوئے ہیں لوگ

جہاں تک شمیم صاحب کی غزلوں کا تعلق ہے تو سطور بالا میں اس کی بابت عرض کیا جا چکا، ملاحظہ کیجئے ان کا یہ رنگ ؎

ان کی آنکھوں میں یہ جادو کہاں ممکن تھا شمیم
میری غزلوں سے کوئی شعر چرایا ہوگا
نگاہوں میں اتنی جسارت کہاں تھی
نظارے ہمیں حوصلہ دے رہے ہیں
تمہیں افسردہ خاطر دیکھ کر دنیائے الفت میں
خدا شاہد ہے اپنی بھی خوشی دیکھی نہیں جاتی
زاہد کو فقط ایک قیامت کی پڑی ہے
ہر لمحۂ تنہائی یہاں حشر نما ہے
میں نہ کہتا تھا بے حجاب نہ ہو
ہوگیا اک جہاں تماشائی

اور باکمال شاعر کا یہ انفرادی رنگ بھی دیکھیے ؎

ہر اک ٹکڑے میں ہے صورت تمہاری
مرا دل ٹوٹ کر بھی آئنہ ہے

شمیم صاحب کے یہاں حکمت بھی ہے، زندگی کے مسائل بھی ہیں، بدلتی قدروں پر نقد بھی ہے، سماجی رویوں پر گفتگو بھی ہے، دیکھیے شمیم صاحب کیسے نصیحت کرتے ہیں اور بدلتے ہوئے سماج کی طرف کیسے اشارہ کرتے ہیں ؎

میری آنکھوں کو چھپر دکھائی نہ دیں
اس قدر جذبۂ عرش بینی نہ ہو
بے ربط سیاست کی راہوں پہ چلے ہوتے
لوگوں کی طرح ہم بھی دنیا میں بھلے ہوتے
دنیا کی محبت نے گمراہ کیا ورنہ
اخلاص کے سانچے میں انسان ڈھلے ہوتے

اس مجموعہ کا زیادہ حصہ نظموں پر مشتمل ہے، نظمیں بھی زیادہ تر کسی نہ کسی موضوع پر ہیں یا خاص عناوین سے معنون ہیں، ان نظموں میں زبان و بیان کی خوبیاں، اسلوب کی کشش، الفاظ کا رکھ رکھاؤ بہت نمایاں ہے، محاورات کے استعمال نے انھیں خوبصورت بنا دیا ہے، یہ نظمیں شمیم صاحب کے جذبات کی ترجمان ہیں، ان کے تجربات و مشاہدات کی آئینہ دار ہیں، ان نظموں میں فکر کی بالیدگی ہے، گہرائی ہے، جدت و جودتِ طبع ہے، مسائل سے دلچسپی نمایاں ہے، حال پر تبصرے ہیں، تعمیر مستقبل کے مشورے اور تمنائیں ہیں، دلکشی و جاذبیت اور تاثیر کے ساتھ سادگی نے ان کے حسن میں اضافہ کیا ہے، صفحات میں گنجائش نہیں کہ میں ان کے منتخب نمونے یہاں پیش کروں، تاہم بحیثیت مجموعی یہ کہنا درست ہے کہ شمیم صاحب نے بارہ بنکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں بلکہ یوں کہیے کہ علمی و ادبی حلقوں میں ایک غیر معروف بستی میں رہ کر اردو کی جو خدمت کی ہے وہ قابلِ رشک اور لائقِ تحسین و صد آفرین ہے، ڈاکٹر انور حسین خاں اور ڈاکٹر مخمور کاکوروی نے اپنے مضامین میں اس کا بھرپور اعتراف کیا ہے۔

☆☆☆